NOVEMBER
2024

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

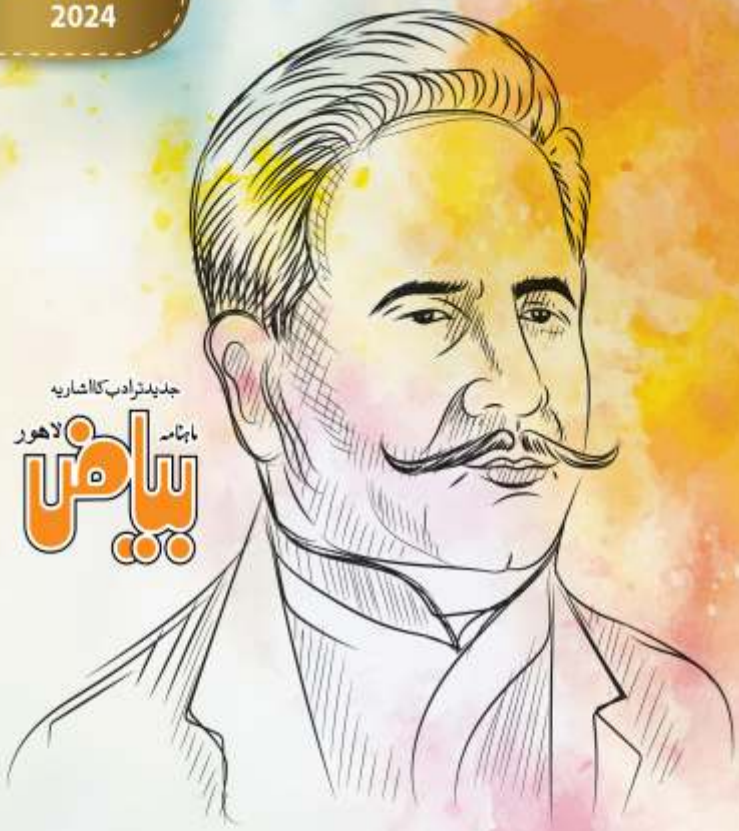

علامہ اقبال

رات مجھے اچھی لگتی ہے
رخشندہ نوید

چند نامور اہلِ قلم
(تنقیدی مضامین)

فریبِ ہستی
افسانوی مجموعہ

جہلم کے افسانہ نگار

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرمِ نوا رہتے ہیں

کتنی مشکل سے کوئی لفظ گہر ہوتا ہے
کتنے سینے صدفِ آہ و بکا رہتے ہیں

فن و فنکار میں رشتہ ہے گل و خوشبو کا
فن و خوشبو بھی سرِ دوشِ ہوا رہتے ہیں

نجمِ غم راہ دکھاتا ہے اسی بستی کی
اسی بستی میں اسیرانِ وفا رہتے ہیں

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

Karachi: (021) 34541301-7 Lahore: (042) 36363300-7
Sialkot: (052) 3554301-6 Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
Faisalabad: (041) 8542924 Peshawar: (091) 5606565 Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا نقشہ گر

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 32 - نومبر 2024 - شمارہ نمبر: 11

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: علامہ محمد اقبالؒ

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور۔ 53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد عمار ٹیکسٹائل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سرور حسین نقشبندی	7
2	نعت	ریاض مجید، جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، شریف ساجد محمد انیس انصاری، علی رضا، اشرف نقوی، سرور حسین نقشبندی ریاض ندیم نیازی، اعجاز دانش، نوید عاجز، اسدرضا سحر، حسنین مظہری	8 تا 21
3	عقیدت	خاور اعجاز، مرزا آصف رسول	22 تا 23
4	رباعیات	گلزار بخاری، محمد نصیر زندہ	24 تا 25
5	مضامین	ابدال بیلا، ریاض مجید، فرحت عباس شاہ، رانا سعید دوشی ثمینہ سید، ظفر اقبال ظفر، شاہ روم خان ولی، احسان اللہ طاہر شاہین عمر، محمد طاہر حسین قادری، بشیر احمد حبیب رانا محمد شاہد، کومل شہزادی، نوید عائل، عمران حیدر تھہیم	26 تا 86
6	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	87 تا 95
7	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، سید افسر ساجد ممتاز اطہر، اعجاز کنور راجہ، حسن عسکری کاظمی سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، نثار ترابی، خاور اعجاز باقی احمد پوری، فرحت عباس شاہ، افتخار شاہد، سید قاسم جلال گلزار بخاری، محمد انیس انصاری، عقیل رحمانی، اقبال سروبہ	96 تا 179

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
7	غزلیں	مسعود احمد، زاہد فخری، راحت سرحدی، شاہین عباس احمد جلیل، اکرم ناصر، رضا اللہ حیدر، ابن عظیم فاطمی افروز رضوی، اکرم سحر فارانی، رانا سعید دوشی، جسارت خیالی محمد نوید مرزا، احمد سبحانی آکاش، محمد سلیم ساگر، رخشندہ نوید الصر حسن، عمران اعوان، طاہر ناصر علی، طلعت شبیر صغیر احمد صغیر، ظہور چوہان، ثمینہ سید، اعجاز روشن اشرف نقوی، نائلہ راٹھور، خالدہ انور، سید تحسین گیلانی اعجاز دانش، شبیر نازش، اصغر علی بلوچ، محمد اشرف کمال اکرم جاذب، نبیل احمد نبیل، راجہ عبدالقیوم وسیم جبران، سرور فرحان، نوید عاجز، مستحسن جامی بشیر احمد حبیب، عاصم بخاری، زبیر خیالی، خالد ندیم شانی اکمل حنیف، مظہر امام، میتھیو محسن، علمدار حسین شاہ روم خان ولی، اسد رضا سحر، عابد رضا، امتیاز انجم فرح شاہد، قمر بشیر، محمد نور آسی، نبیل قیصر، قمر نیاز، عمران ہاشمی امجد خان تجوانہ، غضنفر مہدی، اسیر حیدر، شہزاد ساقی گل عبدالرؤف زین، نینا عادل، عظمیٰ نقوی، اعجاز رضوی	96 تا 179
8	مائکرو فکشن	سید تحسین گیلانی، سیدہ آیت گیلانی، حامد حسن ریاض توحیدی کشمیری، ابن نیاز	180 تا 185
9	افسانے	حنیف باوا، اعجاز روشن، [شفیع ہمدم / مترجم: شعیب الرحمٰن] واجد علی، سیدہ روبینہ بخاری، نوید عائل	186 تا 215
10	نظمیں	خالد احمد، سید افسر ساجد، جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی گلزار بخاری، خالد علیم، محمد انیس انصاری، راجا نیر طاہر ناصر علی، ذکی طارق، ظہور چوہان، نائلہ راٹھور، امجد بابر افتخار شوکت، طلعت شبیر، شبہ طراز، اجمل اعجاز، خالد ندیم شانی محمد اشفاق بیگ، عاصم بخاری، فصیحہ آصف خان، عظمیٰ نقوی نینا عادل، شائستہ رمضان، نوید صادق، اعجاز رضوی	216 تا 241

حمد

یہ جو برکتوں کا حصار ہے مرے چار سو
تری رحمتوں کی بہار ہے مرے چار سو

کئی رنگ ہیں تری شان کے مرے ہر طرف
کئی حیرتوں کا مدار ہے مرے چار سو

ترا اذن ہو تو میں جی اٹھوں رہِ زیست میں
مری بے بسی کا مزار ہے مرے چار سو

میں ادھر ادھر نہیں دیکھتا ہوں اسی لیے
تری بندگی کا خمار ہے مرے چار سو

یہ جو دھندلا پن ہے نگاہ کا یہ اجال دے
مری معصیت کا غبار ہے مرے چار سو

نہیں دسترس کسی بے کلی کی مرے تلک
ترا نام وجہِ قرار ہے مرے چار سو

مرے گردو پیش ہیں خوشبوؤں میں بسے ہوئے
تری حمد جانِ بہار ہے مرے چار سو

مجھے سرور اس کا جمال کیسے دکھائی دے
مری اپنی ذات کا غار ہے مرے چار سو

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

یہی نہیں کہ ثنا کا شعور رکھا گیا
ہمارے دل میں وِلا کا وفور رکھا گیا

اِس آئینے سے ہویدا ہوئے ہیں سارے عکس
سرِ ظہورِ رُخِ آنحضورؐ رکھا گیا

ہُوا وہ آپؐ میں تکمیل یاب ازل میں جو
تھا شاخِ حُسن پہ رسالت کا بُور رکھا گیا

ستم ہُوا ہے بڑا نعت سے، اِسے برسوں
ادب کے مرکزی دھارے سے دُور رکھا گیا

خوشا نصیب وہ وابستگانِ لوح و قلم
وہ جن میں نعت گری کا وفُور رکھا گیا

کرم ہے رب کا جو ہم خاک پیکروں اندر
ثنا تلاش خیالوں کا نُور رکھا گیا

خوشا! ہماری عقیدت طلب جبلّت میں
وِلا کی آگہی، حُب کا شعور رکھا گیا

ہیں ارجمند وہی جن کو، اِس قبیلے میں
ریا و نام وری سے نفُور رکھا گیا

ازل کے دن ہی سے اُمّی لقب کا نُور، ریاض
دلوں کے پاس، نگاہوں سے دُور رکھا گیا

ریاض مجید

نعتؐ

جو دل میں ترا راستہ ٹھانتے ہیں
وہ جورِ زمانہ کو کیا جانتے ہیں

غمِ دہر کی دھوپ کا ڈر انہیں کیا
جو چھتری تریؐ یاد کی تانتے ہیں

یہ اعزاز اپنا کہ سب اہلِ دنیا
ترےؐ نام سے ہم کو پہچانتے ہیں

ترا ورد وہ اسمِ اعظم ہے جس سے
سبھی مشکلیں اپنی آسانتے ہیں

ترا عشق لکھا ہو بختوں میں جن کے
وہ کچھ اور ہی رخت سامانتے ہیں

فلک پر کئی بے ضیا چاند تارے
ترےؐ پاؤں کی خاک ارمانتے ہیں

لہو میں اترتے رہیں عکسِ سیرتؐ
ہمیں آدمی سے جو انسانتے ہیں

جلیل عالی

نعتؐ

ہم نہیں مانگتے اوروں سے بچا کرتے ہیں
آپؐ کے در پہ فقط آ کے صدا کرتے ہیں

سر جھکائے جو گیا اُن کی حضوری میں کوئی
وہ طلب کرنے سے پہلے ہی عطا کرتے ہیں

بھیجتے رہتے ہیں آقاؐ پہ درود اور سلام
یہ عبادت ہے جو بروقت ادا کرتے ہیں

مرضیِ حق ہے کریں اجرِ رسالت بھی ادا
کام یہ آلِ پیمبرؐ کے گدا کرتے ہیں

ہم غلامانِ محمدؐ کے غلاموں کے غلام!
ہم بھری بزم میں یہ بات کہا کرتے ہیں

دعویٰ عشقِ نبیؐ کرتے ہیں ہم لوگ یہاں
جاں ہتھیلی پہ جو رکھتے ہیں بجا کرتے ہیں

اپنی بخشش کی طلب کرتے ہیں جو آقاؐ سے حسن
اور کیا کام کوئی اس کے سوا کرتے ہیں

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

سبھی گلشن پکار اُٹھے، بہار آئی، بہار آئی
"خدا کے فضل سے عالم میں ہے پہلی بہار آئی"

بہاریں اس سے پہلے بھی زمیں پر آئی تو ہوں گی
مگر وہؐ آئے جب تو نور برساتی بہار آئی

نبی تو آخری تھے وہؐ، مگر یہ معجزہ دیکھا
حضورؐ آئے تو اُن کے ساتھ ہی پہلی بہار آئی

بنا یثرب مدینہ جب، مرے آقاؐ کی آمد پر
حضورؐ آئے، حضورؐ آئے، یہ بتلاتی بہار آئی

مبارک یومِ میلادِ نبیؐ آیا تو جی چاہے
بہر دم بس یہی کہتا رہوں میں بھی، بہار آئی

خزاں کے موسموں کا اِک تسلط تھا زمانے پر
حضورؐ آئے تو فوری سبزگی دیتی بہار آئی

یقیناً وقت کے اندر سے اب بھی اِن صداؤں کا
مُسلسل وِرد جاری ہے، بہار آئی، بہار آئی

محمد مصطفیٰ صَلِ علیٰ کو گود لیتے ہی
پکار اُٹھیں حلیمہ سعدیہ بی بی، بہار آئی

نسیمِ سحر

نعتؐ

کون بتا سکا بھلا حدِ کمالِ مصطفیٰ
دنیا کو جگمگا گئی صبحِ جمالِ مصطفیٰ

حال مرا سنور گیا حبِ نبی کے فیض سے
حشر میں بچ ہی جاؤں گا صدقہ آلِ مصطفیٰ

آپ نے گر یہ کہہ دیا ہاں یہ مرا غلام ہے
مجھ پہ کرم سے دیکھیے حسنِ خیالِ مصطفیٰ

دنیا کی ساری نعمتیں زیرِ قدم حضور کے
حق کی طلب بنی مگر مال و منالِ مصطفیٰ

اتنا خلیق و مہرباں مونس و غم گسار ہو
دنیا نہ لا سکی مگر کوئی مثالِ مصطفیٰ

شوق کے پر لگیں اگر ساجدِ خستہ حال کو
طیبہ میں وہ پہنچ سکے مثلِ بلالِ مصطفیٰ

شریف ساجد

نعتؐ

کٹ جائے گی جیون کی سیہ رات کسی دن
ہو جائے گی آقاؐ سے ملاقات کسی دن

آئے گا مدینے سے ہوا کا کوئی جھونکا
مہکیں گے دل و جاں کے مضافات کسی دن

کاسہ لیے بیٹھے ہیں مدینے کے گداگر
بانٹیں گے فقیروں میں وہ خیرات کسی دن

آنکھوں میں سما جائے گا وہ چہرۂ انور
بن جائے گی اپنی بھی یہاں بات کسی دن

روئیں گے کبھی سینۂ اقدس سے لپٹ کر
برسے گی عجب ڈھنگ سے برسات کسی دن

گردش میں ہو پھر دودھ کا پیالہ سرِ مجلس
لوٹ آئے وہی دورِ عنایات کسی دن

پائیں گے انیسِ دل و جاناں کو مقابل
اُٹھ جائیں گے آنکھوں سے حجابات کسی دن

محمد انیس انصاری

نعتؐ

حیاتِ شاہِ رسُل داستانِ رحمت ہے
کمالِ سرورِ عالم کی شانِ رحمت ہے

اک ایک قولِ نبیؐ کا بیانِ رحمت ہے
نبیؐ کا حُسنِ عمل ترجمانِ رحمت ہے

مرے سخن کے لیے میرے فکر و فن کے لیے
ایک ایک نعت کا مصرع نشانِ رحمت ہے

یہ اذنِ مدحت و توصیف بھی کرم ہی تو ہے
جو میرے لب پہ ازل سے بیانِ رحمت ہے

غموں کی دھوپ میں وحشت کی بے کرانی میں
نبیؐ کا بابِ عطا سائبانِ رحمت ہے

وہیں سے فیض اُٹھایا ہے ہر زمانے نے
حضورؐ! آپ کا در آستانِ رحمت ہے

حضورؐ! آپ نے بخشا وقار انسان کو
حضور! آپ کا اُسوۂ جہانِ رحمت ہے

رکھا ہے اس نے ہمیشہ مجھے پناہوں میں
جو سر پہ سایہ فگن آسمانِ رحمت ہے

میں پنجتن پہ دل و جان سے فدا ہوں رضا
یہ خانوادہ سبھی کاروانِ رحمت ہے

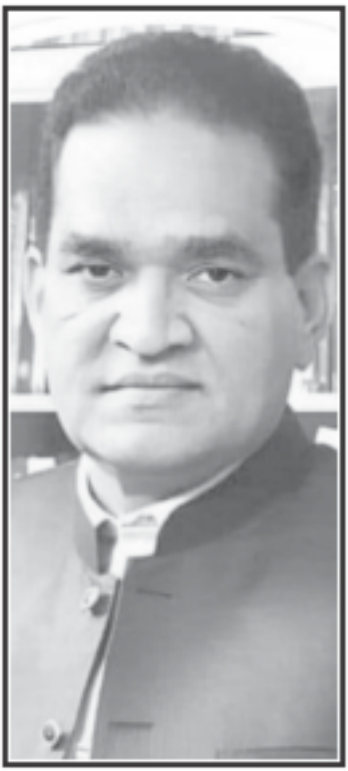

علی رضا

نعتؐ

کُن کی حضورؐ! ساری کہانی ہے آپؐ سے
دریائے زندگی میں روانی ہے آپؐ سے

صبحِ ازل کا آپؐ ہی تھے نورِ اولیں
گود دیکھنے میں دُنیا پرانی ہے آپؐ سے

ہم کو خدا سے آپؐ نے ہی آشنائی دی
پہچانی ہم نے رب کی نشانی ہے آپؐ سے

ہر آئنے کو آپؐ سے حیرت عطا ہوئی
اور عکس پر بھی آقاؐ جوانی ہے آپؐ سے

میرے سخن کو آپ نے تاثیر بخش دی
پُرسوز میرا حرف و معانی ہے آپؐ سے

آقا! فقط تمھارے ہی در کا ہوں میں گدا
سو بھیک جو بھی چاہیے، پانی ہے آپؐ سے

دامن بروزِ حشر نہ چھوڑوں گا آپؐ کا
بخشش حضور! میں نے کرانی ہے آپؐ سے

جب تک نہ آپؐ آئے تھے، بے کیف زیست تھی
صبح و مسا حیات سُہانی ہے آپؐ سے

اشرف ہے آقاؐ! تیرہ شبی میں گھرا ہوا
اِس نے تجلی نور کی پانی ہے آپؐ سے

اشرف نقوی

نعتؐ

سر بہ سر بالیقین ہے ساری
پیروی ان کی دین ہے ساری

جو بچھائی گئی مدینے میں
آسمانی زمین ہے ساری

شہرِ طیبہ میں آ کے لگتا ہے
زندگانی حسین ہے ساری

عافیت جو زمین پر اُتری
اس نگر میں مکین ہے ساری

شب اترتی ہے کیا مدینے میں
تیرگی مہ جبین ہے ساری

چھب حسین و حسن کے چہرے پر
عکسِ روئے مبین ہے ساری

ان کا دیدار ہونے والا ہے
موت بھی دل نشین ہے ساری

نعت ایسی مٹھاس ہے سرور
شہد ہے انگبین ہے ساری

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

یہ جو نور پیکر ہے، گود میں حلیمہؓ کی
دو جہاں کا سرور ہے، گود میں حلیمہؓ کی

راستے ملے جس سے، منزلیں ملیں جس سے
یہ وہی تو رہ بر ہے، گود میں حلیمہؓ کی

جس نے اپنی سیرت سے تیرگی مٹا ڈالی
نور کا سمندر ہے، گود میں حلیمہؓ کی

جس زمیں پہ کرتے ہیں ہم عبادتیں لوگو
اُس زمیں کا امبر ہے، گود میں حلیمہؓ کی

اولیا کا آقا ہے، انبیا کا سیّد ہے
وہ حضورِ انور ہے، گود میں حلیمہؓ کی

روشنی سے بھر ڈالا جس نے ساری دنیا کو
وہ چمکتا گوہر ہے، گود میں حلیمہؓ کی

جس کو پی کے وحدت کا نشہ طاری ہوتا ہے
ایسا جام و ساغر ہے، گود میں حلیمہؓ کی

اور کیا لکھوں لوگو اِس سے بڑھ کے مدحت میں
پنج تن کا یاور ہے، گود میں حلیمہؓ کی

اہلِ بیتؑ کا دل بر اور ندیم سمجھو تو
روشنی کا خاور ہے، گود میں حلیمہؓ کی

ریاض ندیم نیازی

نعتؐ

حال ہے غم سے مرا ابتر امام الانبیا
آ گیا ہوں آپ کے در پر امام الانبیا

میرے دو عالم میں ملجا اور ماویٰ آپ ہیں
چھوڑ دوں کیوں آپ کا یہ در، امام الانبیا

مالکِ کونین نے مالک بنایا آپؐ کو
آپؐ کے تابع ہیں بحر و بر امام الانبیا

ہم گنہ گاروں پہ بھی چشمِ کرم ہو جائے گی
آئیں گے جس دم سرِ محشر امام الانبیا

آپؐ کے در کی گدائی ہو گئی جس کو نصیب
کیا کرے وہ لے کے مال و زر، امام الانبیا

میں بھلا کیسے تری رفعت کا اندازہ کروں
خاکِ پا تیری مہ و اختر امام الانبیا

احتراماً سر بہ خم تھے منتظر سارے نبی
جب ہوئے اقصیٰ میں جلوہ گر امام الانبیا

آپؐ کی چوکھٹ پہ رہتا ہے فرشتوں کا نزول
میں بھی دیکھوں وہ کبھی منظر امام الانبیا

آخری اعجاز دانش کی ہے خواہش بس یہی
آپؐ کی چوکھٹ ہو میرا سر امام الانبیا

اعجاز دانش

نعتؐ

گل تیرے لیے، بادِ صبا تیرے لیے ہے
یہ گلشنِ ہستی تو شہا تیرے لیے ہے

لولاک لما میں بھی بتلایا گیا ہے
یہ جلوہ گہِ ارض و سما تیرے لیے ہے

اک شخص کو رب اذنِ دعا حشر میں دے گا
لاریب کہ وہ اذنِ دعا تیرے لیے ہے

ہے سارا جہاں جس کے لیے مدح سرا، وہ
ممدوحِ جہاں مدح سرا تیرے لیے ہے

ہے تیرے لیے مژدہ رفعنا لک ذکرک
یعطیک فترضیٰ کی عطا تیرے لیے ہے

یعقوب کی اولاد ترستی رہی جس کو
وہ ختمِ نبوت کی قبا تیرے لیے ہے

دھو ڈالے گی عاجز وہ گنہ سارے تمہارے
طیبہ کی وہ رحمت کی گھٹا تیرے لیے ہے

نوید عاجز

نعتؐ

اسد رضا سحر

موسیٰ درود پڑھتا ہے سجدے میں طور ہے
دھرتی پہ آج کس کا یہ جشنِ ظہور ہے

سارے جہاں پہ کھل گیا صلے علیٰ کا بھید
سارا جہان کہتا ہے جشنِ حضورؐ ہے

کرنا پڑے گی اور ذرا معرفت بلند
شہرِ مدینہ مجھ سے بھلا کتنا دور ہے

بتلا رہی ہے مجھ کو مری آنکھ کی نمی
قسمت میں مصطفیٰ کی زیارت ضرور ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سلسلے بند کیے ، مہر لگا دی تو نے
صفحۂ ارض پہ اک آخری اُمت لکھی

نعتؐ

انوار کا وفور ہے جالی کے اُس طرف
اک کائناتِ نور ہے جالی کے اُس طرف

صدیق اور عمر ہی سے پوچھیں کہ کس قدر
تسکین ہے سرور ہے جالی کے اُس طرف

پاتے ہیں جس سے دونوں جہاں نور آگہی
وہ منبعِ شعور ہے جالی کے اُس طرف

اٹھتی ہے دل سے چھولوں غلافِ مزارِ پاک
لیکن پہنچ سے دور ہے، جالی کے اُس طرف

یہ اور بات جانے سے عاجز ہے آدمی
کھنچتا مگر ضرور ہے جالی کے اُس طرف

آتی ہے اب بھی وادیِ ایمن سے یہ صدا
رشکِ کلیمِ طور ہے جالی کے اُس طرف

جی چاہتا تو ہے کہ لپٹ جاؤں مظہریؔ
پر تربتِ حضور ہے جالی کے اُس طرف

حسنین مظہری

عقیدت

روتا ہے بے بسی پہ جو دریا فرات کا
سامان کر رہا ہے وہ اپنی نجات کا

کہتے ہیں جس کو ہم شبِ عاشور کی سحر
دراصل ہے وہ چہرا اُتر جانا رات کا

میدانِ کربلا ہے زوالِ تغیرات
رستہ نکل رہا ہے یہاں سے ثبات کا

حُر کی طرح بدلتا ہے پھر نقطۂ نگاہ
کھلتا ہے جن پہ عقدہ حیات و ممات کا

تحریک ہے جہاں بھی کہیں جبر کے خلاف
پرتو ہے وہ حسینؓ کی ذات و صفات کا

مَیں نے لگائی آنکھ میں جب خاکِ کربلا
منظر دکھائی دینے لگا شش جہات کا

میرا سلام کہنا حضورِ حسینؓ اور
کہنا کہ کوئی حل ہے مِری مشکلات کا

نم ہو گئی ہے آنکھ، زباں خشک ہو گئی
اَب اختتام ہوتا ہے صبر و ثبات کا

خاور اعجاز

سوئے طیبہ

نگاہِ شوق ہے باچشمِ تر سوئے طیبہ
کہ ہوں گے ہم بھی کبھی بخت ور سوئے طیبہ

یہ راہِ وجد ہے اُن رحمتوں کے سائے میں
کہ دھوپ بھی لگے مثلِ شجر سوئے طیبہ

ہے رخشِ عمر تو جس رَو میں خود بھلے نہ تھمے
مگر تو لے جا مجھے تھام کر سوئے طیبہ

متاعِ صلی علیٰ کے امیں ہیں اِس لیے ہم
کہ سب کا دھیان رہے عمر بھر سوئے طیبہ

یہ رُو بہ قبلہ عبادت بجا مگر اے زیست!
نمازِ عشق ہو شام و سحر سوئے طیبہ

اُسی کا تا بہ ابد ہے جہاں رہینِ کرم
کھلا جو نعمت و بخشش کا در سوئے طیبہ

فلا وربک لا یومنون ہے جب تک
رہے گی چشمِ نیازِ بشر سوئے طیبہ

ہر امتیاز پہ ہے ضربِ اِنَّ اکرمکم
کہ ساری خلق ہو تقویٰ نگر سوئے طیبہ

کیا تو حق نے اُنھیں رُو بہ قبلہ ہی آخر
جہاں کو پہلے بلا کے مگر سوئے طیبہ

نہ کیوں ہوں جذبہ و جذباتِ حق کے مظہر سب
دلوں کا جذبِ دروں ہو اگر سوئے طیبہ

زمیں سے تا بہ خلا جا کے بھی یہی ہو گا
کہ آئیں گے سبھی علم و خبر سوئے طیبہ

جہاں میں رہنا ہے اے قوم! سربلند اگر
چلو جھکا کے سبھی اپنے سر سوئے طیبہ

دکھائی دے کیسے؟ اللہ اور رسولؐ کا حق
نہ جب تلک اُٹھے دل کی نظر سوئے طیبہ

یہیں ملی ہے بشارت لاَاَغْلِبَنَّ اَنَا
اب آئے گا نہ کوئی کروفر سوئے طیبہ

وہی صراط ہے پھر مستقیم آگے بھی
ہے پہلے جس پہ یقیں کا سفر سوئے طیبہ

ز ندامتِ عصیاں! تو مجھ کو توڑے کہیں
تو پھر بکھیر بہ ہر رہگزر سوئے طیبہ

سپردِ صلِ علیٰ عرضِ حال کر آصف!
کہ اس سے بڑھ کے نہیں نامہ بر سوئے طیبہ

مرزا آصف رسول

رباعیات

رکھتے ہیں عجب رخت کراچی والے
گویا کہ ہیں خود تخت کراچی والے
دنیا انھیں قائد کا نگر کہتی ہے
کس درجہ خوش بخت کراچی والے

بخشی جسے خالق نے فضا درگاہی
افراد ہی اخلاص و وفا کے رائی
کرتے ہیں عقیدت سے بپا جشن عجب
ملتان کی ہے شان حسین آگاہی

گنجینہ یہی سیم و زر و مال کا ہے
بنیاد معیشت کے لیے ڈھال کا ہے
خالق نے اسے خاص فضیلت بخشی
یہ شہر کہ جو فیض کا اقبال کا ہے

گم نام نہیں نام و نشاں والی ہے
خاموش نہیں نطق و زباں والی ہے
گلزار اسے سمجھے نہ کوئی لاوارث
دھرتی یہ سہاگن ہے ، میانوالی ہے

لطف و کرم و فیض کا مظہر سمجھیں
انسان کی تقدیر کا جوہر سمجھیں
دنیا جسے کہتی ہے دبستانِ رموز
لاہور کے خطے کا مقدر سمجھیں

گلزار بخاری

رباعیات

مینا و سبو آنکھ کے گھر میں پڑے ہیں
انوار سبھی روزنِ در میں پڑے ہیں
دیکھو تو ہوا نکال کے پھوڑ کے سر
قلزم کئی بلبلے کے سر میں پڑے ہیں

آرام نہیں رات کو رونے کے سوا
ہونا بھی یہاں کچھ ہے نہ ہونے کے سوا
شاید تعبیر سے گریزاں کوئی خواب
سونے کے پلنگ پر ہے سونے کے سوا

تخلیق کو رم موجِ قلم دیتی ہے
فردا کی خبر نشاطِ غم دیتی ہے
نیزے پہ نئی صبح کا سورج ہو گا
مٹی نیا آدمی جنم دیتی ہے

رنگِ نظر آشوب کے پیکر دیکھے
ساغر میں سسکتے ہوئے منظر دیکھے
عورت دیکھی سات سمندر پیاسی
بچے اس میں سات سمندر دیکھے

حسرت کو عیاں آنکھ سے ہونے نہ دیا
مغرور انا نے مجھے رونے نہ دیا
کل رات مرے خیال کی لگ گئی آنکھ
کل رات ترے خواب نے سونے نہ دیا

گرد اڑ کے مری دیدۂ اختر میں پڑی
سخت ابتری افلاک کے لشکر میں پڑی
پوشاک سمندر کی پہن لی میں نے
پھونک ایسی حباب کاسۂ سر میں پڑی

تہذیب کے حیوان سے ڈر لگتا ہے
ابلیس کے سلطان سے ڈر لگتا ہے
آئینہ مجھے دیکھنے کی تاب نہیں
اس دور کے انسان سے ڈر لگتا ہے

صورت زدگاں امنگ میں مارے گئے
آئینے دیارِ سنگ میں مارے گئے
فریاد کہ آرزو گزیدہ ہوئے خواب
دل زادہ اشکوں کی جنگ میں مارے گئے

محمد نصیر زندہ

قریش اور مکے کی حکمرانی

آل اسماعیل پھر مکہ میں جمع ہوگئی۔
یوں تو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے عرب بھرا پڑا تھا، مگر قصی نے اپنی اوپر کی آٹھ پشتوں کی اولاد مکہ میں جمع کرلی۔
قریش قبائل کا اطلاق نضر بن کنانہ کی اولاد سے ہونے لگا۔
قریش کا لفظ تقرش سے مشتق ہے۔
معنی اس کے ہیں بکھرنے کے بعد جمع ہوجانا۔
قصی نے ان کو جمع کیا تو ان قبائل کا اجتماعی نام قریش ہوگیا۔
کہنے کو ان قبیلوں کے اپنے اپنے نام بھی رہے۔
تقرش کا لفظ صفاتی لحاظ سے کسب اور تجارت کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ چونکہ ان جمع ہوئے قبائل کا عمومی کسب تجارت ہی تھا۔ اس لیے بھی یہ نام قریش ان پہ صادق آ گیا۔ عربی بڑی فصیح و بلیغ زبان ہے۔
تقرش کے ایک معنی تلاش اور جستجو کرنے کے بھی ہیں۔ قصی نے اپنے اجداد کے قبائل یکجا کرنے کے لیے ان کی تلاش اور جستجو بھی کی تھی۔ یوں یہ نام قریش کی ایک اور مساحت بن گیا۔ عربوں میں صحرائی قبائل دوسرے قبیلوں پہ اپنی فوقیت جتانے کے لیے کوئی بہانہ ضائع نہیں کرتے۔ ان کی ڈکشنری میں قریش قرش کی تفسیر بھی تھا۔ اور قرش ایک بڑی سمندری مچھلی کو کہتے تھے جو چھوٹی مچھلیاں کھا جاتی تھی۔ انہوں نے اپنے قریشی نام سے دوسرے قبائل کو یہ بھی جتادیا کہ اب تم ہمارا لقمہ بنو ہی بنو۔
یہ تو ہوئیں وہ پانچ وجہیں قریش اصطلاح رائج ہونے کی، ایک چھٹی وجہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ کنانہ بن خزیمہ کے پوتے کا نام قرش تھا۔ اُسکا قبیلہ بھی ان قبائل کی جتھہ بندی میں مکہ آ گیا۔
یوں یہ نام اور مستحکم ہوگیا۔
کہتے ہیں اُسی قریش بن حارث کا بیٹا بدر بن قریش تھا۔
اس بدر نامی لڑکے نے مکہ سے دُور یثرب

ابدال بیلا

کے پاس ایک تجارتی گذرگاہ کے پاس ایک کنواں کھدوایا تھا۔ اس کنویں کے وجہ سے وہ جگہ ہی بدر کہلانے لگی۔

یہ وہی جگہ ہے جہاں مسلمانوں اور کافروں کی پہلی جنگ کا ہونا لکھا گیا تھا۔

جنگ بہر حال ہوئی۔

قصّی کے صحرائی قبائل زور آور تھے۔

اُوپر سے اس کے سوتیلے بھائی رزاح کی دُور شامی سرحد سے رسد آ گئی۔ بنو قضاعہ جن کے قافلے کے ساتھ قصّی مکہ آیا تھا وہ بھی تلواریں نکال کے اس کی مدد کو آ گئے۔ ان سب کے مد مقابل بنو خزاعہ کے بھی کچھ حلیف تھے۔ ان میں خاص طور پہ بنو بکر آگے آگے تھا۔

خوب لڑائی ہوئی۔

بہت خون بہا۔ دونوں طرف سے لوگ گرے۔ بنو خزاعہ اور بنو بکر کا نقصان زیادہ ہوا۔ آخر اردگرد کے امن پسند قبائل درمیان میں جنگ بندی کے لیے آ گئے۔ طے یہ ہوا کہ فریقین عمرو بن عوف بن کعب کو اپنا ثالث مقرر کر لیں۔ دونوں فریقوں نے اُسے ثالث منظور کر لیا۔ اقرار کر لیا کہ اگلے دن صحن کعبہ میں آ کر دونوں فریقوں کے مابین وہ جو بھی فیصلہ دے گا اس کی پیروی کی جائے گی۔

اگلے دن کا بیتابی سے انتظار ہونے لگا۔

اگلا دن آ گیا۔

دونوں فریق صحن کعبہ میں موجود تھے۔

عمرو بن عوف فیصلہ سنانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

دونوں فریق لب بستہ ہو کے سننے لگے۔

عمرو بن عوف گرجدار آواز والا موٹا اونچا مضبوط آدمی تھا۔

اونچی آواز میں بولا،

میرا فیصلہ کان کھول کے سن لو۔

دونوں فریقین کے درمیان جو خون ریزی ہوئی میں اسے اپنے اِن دو قدموں کے نیچے روندتا ہوں۔ جو ہوا ہو گیا۔ اب کوئی خون خرابہ نہیں ہو گا۔ نہ کوئی فریق کسی فریق کا خون بہا دے گا۔ رہ گئی بات تولیت کعبہ کی تو میں نے حسب نسب اور تاریخی حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ مکہ کا متولی قصّی ہو گا۔ بنو خزاعہ اور بنو بکر اپنے تمام تر اسباب کے ساتھ مکہ کی حدود سے باہر جا کے رہنے کے پابند ہوں گے۔ فیصلہ سنا دیا گیا۔ تعمیل ہو۔

تعمیل ہوئی۔

فیصلہ سنانے والا عمرو بن عوف، اپنے فیصلے کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے یکثر بن عوف کہلانے لگا۔ کیونکہ دونوں پیروں تلے روندنے والے

کو عرب کی زبان میں یثرب ہی کہا جاتا ہے۔
قصی، دور سے آنے والا، مکہ کا سربراہ بن گیا۔
اس نے رئیس مکہ کے تمام حق ادا کر دیے۔
اس سے پہلے خدا کے گھر کے طواف، حج اور عمرہ کے لیے آنے والوں کی آسانی کے لیے کوئی طے شدہ سہولتیں نہیں تھیں۔ کہنے کو دور سے آئے زائرین سے بھتہ لیا جاتا تھا۔
مگر ان کے رہنے، کھانے اور پینے کے لیے انتظامات نامکمل اور غیر مربوط تھے۔ مکہ کے رہائشی لوگ بھی شہری سہولتوں سے نابلد تھے۔ ان کی باہمی مشاورت کے لیے کوئی مروجہ جگہ تک نہ تھی۔ جنگ اور امن کے دنوں میں بھی وہ قبائل اپنی اپنی بولیاں بولتے تھے۔
مکہ میں قصی کے آنے تک لوگ جھونپڑیاں بنا کے صحرائی خانہ بدوشوں کی طرح رہا کرتے تھے۔ قصی نے جب اپنے اجداد کے قبائل جمع کر لیے تو انہیں کچے پکے مکان بنا کر رہنے کو کہا۔ رہنے کے لیے مکانوں کی تعمیر کے لیے پہاڑی دروں، گھاٹیوں اور ڈھلوانوں پہ خودرو اگے درختوں کو کاٹنے کا حکم دیا۔ ان درختوں کو کاٹنے سے نہ صرف رہائشی قطعات کے لیے جگہ ملی بلکہ مکانوں کی تعمیر کے لیے لکڑی بھی دستیاب ہو گئی۔
قصی سے پہلے لوگ ان درختوں کو احترام کعبہ میں کاٹنے سے ڈرتے تھے۔ قصی نے کعبہ کی بستی کو بسانے اور سجانے کے لیے انہیں ان خاردار درختوں کو کاٹنے پہ رضامند کر لیا۔
یہی نہیں پہلا درخت اپنے ہاتھ سے قصی نے کاٹا۔
مکہ میں لوگ بسنے لگے تو کچھ قبائل وادی میں ریت اور پتھروں کے گھر بنانے لگے۔
اس وادی کے کئی نام تھے۔
اسے ابطح، بطحا اور بطاح ناموں سے پکارا جاتا تھا۔
جو قبائل وہاں گھر بنا کے رہنے لگے، انہیں ''مطیبین'' کہا جانے لگا۔
یہ قریش البطاح بھی کہلاتے تھے۔
ان قبائل کی اکثریت تھی۔
کچھ قریشی قبائل نے اپنے رہنے کے لیے مکہ کی پہاڑیوں کی ڈھلوانوں کو پسند کیا۔
یوں وہ لوگ مکہ کے بالائی حصے میں مقیم ہو گئے۔ انہیں قریش ظواہر کہا جانے لگا۔
سب آباد ہو گئے تو مکہ ایک شہر بن گیا۔
یوں قصی نے مکہ کی وادی کو پہلی بار ایک شہری نظام سے متعارف کرایا۔ اس شہری ریاست کو چلانے کے لیے اس نے سات طرح کے مناصب رائج کیے۔
پہلا منصب حجابہ کا تھا۔

یہ منصب کعبہ کو حجاب میں رکھنے کا تھا کہ ہر کوئی کعبے میں نہ گھومتا پھرے۔ کہنے کو کعبے کی چابی پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔ مگر قصی نے کعبہ کے دروازے کو کھولنے اور بند کرنے کے ضابطے مقرر کیے۔ کب دروازہ کھلے گا۔ کون کھولے گا۔ اور جو کھولے گا، جس کے پاس چابی ہوگی وہی کعبے میں نذرانے کے طور پہ لائی گئی امانتوں کی حفاظت بھی کرے گا۔

دوسرا منصب رفادہ رکھا گیا۔

قصی نے اپنے لوگوں کو جمع کر کے گفتگو کی۔

بولا،

خدا کے گھر کی زیارت کے لیے آنے والے خدا کے مہمان تصور کیے جائیں۔ ان زائرین کی ضیافت اور میزبانی ہمارا فرض ہے۔ میں اپنے مال سے اس میں حصہ دوں گا۔ تم اپنے مال سے اس میں حصہ ڈالو۔ ایک اجتماعی فنڈ بناؤ اور خدا کے گھر کی طرف آنے والوں کو کھلاؤ۔

تیسرا منصب سقایہ تھا۔

کہنے کو کھانے کے ساتھ ہی پینے کا تصور آتا ہے۔ مگر مکہ ایسی بنجر اور گرم پہاڑی سنگلاخ وادی میں آباد تھا جہاں کھانے اور کھلانے کے لیے اونٹ کا گوشت وہیں سے مل جاتا تھا مگر پیٹ بھر کر پینے کے لیے پانی وادی سے باہر جا کر لانا پڑتا تھا۔ کعبہ کے صحن میں زم زم کا کنواں پچھلے تقریباً پانچ سو سالوں سے بند پڑا تھا۔ قصی کی نسل کے لوگ اس کنویں سے ناواقف تھے۔ انہیں علم ہی نہیں تھا کہ کبھی یہاں خدا کے گھر کو بنانے والے آئے پہلے زائر کی ایڑھیوں سے یہ چشمہ جاری کیا گیا تھا۔ جو شاید بتوں کو اس مقدس جگہ پہ رکھنے کے باعث چھپا دیا گیا۔ زم زم کا کنواں کھلا ہوتا تو شاید زائرین کو پانی پلانا مشکل کام نہ ہوتا۔ مگر اس کے نہ ہوتے ہوئے یہ ایک کٹھن ذمہ داری تھی۔ قصی نے چمڑے کے بڑے بڑے ٹب بنوائے۔ مکے کے باہر سے اونٹوں پہ چمڑے کی مشکیں لاد کے پانی لایا جاتا۔ پھر اس پانی کو چمڑے کے حوضوں میں ڈال کے حاجیوں کے لیے رکھا جاتا۔ یہی نہیں اس پانی کو خوش ذائقہ اور غذائیت سے بھرپور بنانے کے لیے اس میں کاٹ کاٹ کے خشک میوے خصوصاً کشمش کو ڈالا جاتا۔

چوتھا منصب ندوۃ کہلاتا تھا۔

قصی سے پہلے تو مکہ میں کوئی پکا مکان تک نہ تھا۔ اس نے رہائشی قبائل کو مستقل مکانوں کی تجویز دی تو رئیس مکہ کے لیے ایک وسیع عمارت بنوائی جس کا صدر دروازہ صحن کعبہ میں کھلتا تھا۔ صحن کعبہ کی ان دنوں کوئی بیرونی دیوار نہیں ہوتی تھی۔ کہنے کو کعبہ کے

اطراف میں بنائے جانے والے گھروں کے دروازے کے ناموں سے کعبے کے دروازوں کے نام پڑ گئے۔ قصّی نے دارالندوہ کے نام سے جب بڑا گھر بنوایا تو وہ اس کے عہد کے لوگوں کے لیے اجتماعی مشاورت کی جگہ بن گیا۔ آج کے دنوں میں جیسے پارلیمنٹ کی عمارت ہوتی ہے۔ ان دنوں دارالندوہ کی عمارت یہی فرض پورا کرتی تھی۔ یہی نہیں، مکہ کے سماج کی اجتماعی تقریبات وہاں منعقد ہوتیں۔ شادی بیاہ، خوشی غمی میں دارالندوہ کے دروازے کھل جاتے۔

ہر تقریب وہاں منائی جاتی۔

یہاں تک کہ قبائل گھروں کی کوئی لڑکی جب بلوغت کو پہنچتی تو اس کے احترام کے لیے اسے پہلی بار اس عمارت میں لوگوں کے سامنے تحائف پیش کر کے اوڑھنی اوڑھائی جاتی۔ ویسے تو قبائل مکہ کا ہر فرد وہاں آ جا سکتا تھا، مگر دارالندوہ محفل مشاورت کے لیے جب بلائی جاتی تو قبائل کے صرف سرکردہ افراد جمع کیے جاتے۔ جو اہم فیصلوں کے لیے اپنی رائے دیتے۔ وہاں رائے دینے والے سرکردہ چنے لوگوں پہ بھی ایک شرط عائد تھی۔ شرط یہ تھی کہ ان کی عمر چالیس سال سے کم نہ ہو۔

بڑے فیصلے امن کی بجائے جنگ کے لیے ہوا کرتے تھے۔

جنگ کی حالت میں قبائل کی سرداری اور علم برداری کا منصب بھی بنایا گیا۔

یہ پانچواں منصب اللواء کہلاتا تھا۔

قبائل میں باہمی ربط رکھنے اور ایک طے شدہ سالار کے پیچھے تلواریں سونپ کے لڑنے کی ترغیب عرب کے آزاد صحرائی قبائل میں نئی چیز تھی۔ قصّی نے جہاں اپنے اپنے قبائل کے لیے ذمہ داریاں رکھیں وہاں آنے والے زائرین کے فرائض بھی طے کر دیے۔

زائرین سے ٹیکس کی صورت میں بھتہ تو قصّی سے پہلے بنو جرہم اور بنو خزاعہ کے سرپنچ بھی لیا کرتے تھے۔ مگر ان کی زائرین سے وصولی طے شدہ ٹیکس کی بجائے لوٹ مار اور دھونس دھاندلی زیادہ لگتی تھی۔ قصّی نے اصول بنا دیا کہ مکہ آنے والے زائرین اور تاجر لوگوں میں فرق رکھا جائے۔ ٹیکس کی بھی ایک حد مقرر کر دی۔ تمام غیر مقامی لوگ اپنی آمد پہ اپنے تجارتی اثاثے کا دس فیصد مکہ کی انتظامیہ کو دینے کے پابند بنا دیے گئے۔

اس لیے یہ ٹیکس عشر کہلانے لگا۔

یہ عشر دے کر آنے والے، اپنے آنے والے دنوں میں مکہ میں قیام کے دوران

کھانے، پینے اور رہائش کی مفت سہولتیں حاصل کرتے۔

قصی نے جہاں قبائل قریش کو زائرین کعبہ کی آسائش بہم پہنچانے پہ راضی کیا وہیں کچھ اپنے قبائل کی فوقیت کے لیے رسومات بھی رائج کر دیں۔ ان رسومات میں سے اکثر کا تعلق اپنے لوگوں کی تن آسانی اور باہر سے آئے غیر قریشی لوگوں پہ مقامی لوگوں کی برتری، نفع آوری اور سہولت کا حصول تھا۔ مثلاً یہ طے کیا گیا کہ باہر سے آنے والے حاجی کعبہ کے طواف، صفا مروہ کے درمیان چلنے کے بعد منیٰ اور مزدلفہ سے ہو کے میدان عرفات میں جائیں گے۔ مگر میدان عرفات میں قیام کی شرط مقامی قریشیوں پہ نہ ہوگی۔

میدان عرفات پہ وقوف حج کی شرط تھی مگر وہ اس سے نکل گئے۔

اپنی امتیازی شان بنانے کے لیے انہوں نے باقی زائرین کے لیے تو اونٹ اور بکریوں کی اون اور بالوں سے بنے سستے سائبانوں کو مکہ، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں رائج رکھا مگر اپنے لوگوں کے لیے ایسے کم قیمت خیموں میں ٹھہرنے کی ممانعت کر دی۔ اپنے لوگوں کے لیے لازم کر دیا کہ وہ کالے بھدے بالوں والے خیموں کی بجائے لال رنگ کے یمنی کم خواب والے کپڑوں سے بنے چھوٹے چھوٹے شامیانے لگا کے ٹھہریں گے۔ اور اپنے لوگ حج کے دنوں میں گھی کو پکا کے صاف کرنے کی زحمت بھی نہ کریں۔

کچھ رسمیں جو پہلے سے رائج تھیں وہ جاری رکھیں۔

مثال کے طور پہ باہر سے آنے والوں پہ لازم تھا کہ وہ خانہ خدا کے طواف کے لیے مخصوص دو کپڑے مکہ سے خریدیں گے۔ اگر کوئی خریدنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو وہ غریب اپنی آسانی کے لیے کپڑوں کے بغیر ننگا ہو کے خدا کے گھر کا طواف کیا کرتا تھا۔

قصی نے مزدلفہ میں حج کے دنوں میں مسلسل آگ کے الاؤ جلا کے روشنی رکھے جانے کی رسم بھی شروع کر دی۔ کہنے کو اس سے رات سے زائرین کو راہ دیکھنے میں سہولت رہتی۔ مگر کچھ لوگ اس بت پرستی کے دنوں میں حج کرتے کرتے اس آگ کی پرستش بھی کرتے جاتے۔

بہر حال قصی مکہ کی شہری بستی کا پہلا حکمران بن گیا۔

اس نے بڑی لگن، جذبے اور دبدبے سے حکمرانی کی۔

اس کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔

عبد مناف، عبدالدار، عبدالعزیٰ اور عبد قصی بیٹوں کے نام تھے۔ اور بیٹیاں تخمر اور برہ تھیں۔ ان سب کی ایک ہی ماں تھی، پرانے رئیس مکہ حلیل بن کعب بن عمرو الخزاعی کی بیٹی حُبّی۔

قصی نے طویل عمر پائی۔

اس کی عمر میں ہی اُس کے بیٹے معاشرے میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ یوں تو اُس کے سبھی بیٹے بہادری، سخاوت اور اعلیٰ ظرفی کے معیار پہ قرب وجوار میں مشہور تھے۔ تاہم چاروں بیٹوں میں دوسرا بیٹا عبد مناف اپنی شخصیت کی دل آویزی، حکمت اور بہترین سفارت کاری کے باوصف مکہ کی بستی میں ہی نہیں، بلکہ دُور کی بڑی ریاستوں تک تعلقات بنا چکا تھا۔

یہ عبد مناف ہی تھا جس نے عرب کے ریگزاروں سے نکل کے دُور شمال مغرب میں شام اور روم کے فرمارواہرقل سے پرامن تجارت کی غرض سے اپنی قوم کے لیے اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔ ظاہر ہے ان تجارتی کاروانوں کو لاتے لیجاتے اس کی مالی حالت مضبوط ہو گئی تھی۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں قصی کو اپنے سب سے بڑے بیٹے عبدالدار کو بستی میں اپنے چھوٹے بھائی عبد مناف سے معاشرتی اور مالی طور پہ کمزور دیکھ کے پیار آ گیا اور اس نے خانہ خدا کی چابی کے علاوہ خدا کے گھر کی میزبانی کی جملہ ذمہ داریاں اسے سونپ دیں۔ قصی نے عبدالدار کو کہا بھی، بیٹا مجھے پتہ ہے تیرے چھوٹے بھائی تجھ پہ فوقیت حاصل کر چکے ہیں۔

میری کوشش ہے کسی طرح میرے بیٹوں میں اونچ نیچ نہ ہو۔

سبھی معزز ہوں۔

میرا اثاثہ تو تم سب بھائیوں میں برابر بٹے گا، ہاں میرے نام سے جو اعزاز وابستہ ہیں وہ میں تمہیں دیتا ہوں۔ یوں قصی نے خدا کے گھر کی دربانی (حجابت)، سقایہ، رفادہ، لواء، ندوہ اور سربراہی عبدالدار کو دیکر اُسکے قد کو اونچا کر دیا تاکہ وہ عبد مناف کے برابر نظر آ سکے۔

عبد مناف اپنے قد سے بھی کہیں بڑا نکلا۔

ساری عمر اس نے باپ کے بھائی کو دیے اختیارات پہ آنکھ کی پلک تک نہ اٹھائی۔ باپ کے مرنے کے بعد بھائی عبدالدار کی مکمل تعظیم کی۔

دونوں کی اولاد جوان ہو گئی۔

عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔

سب سے بڑا "مطلب"، دوسرا "ہاشم" اور تیسرا "عبد شمس"۔ تینوں بیٹے ایک ہی ماں

سے تھے۔ ماں کا نام تھا عاتکہ۔ یہ مرہ بن ہلال بن فالج بن تعلبہ بن ذکوان کی بیٹی تھیں، جو حضر کی اولاد سے تھا۔ چوتھے بیٹے کا نام نوفل تھا۔ اس کی ماں عاتکہ نہیں واقدہ تھی۔ عاتکہ کے تین بیٹوں کے علاوہ پانچ بیٹیاں بھی تھیں، تماضر، حتہ، قلابہ، برہ اور ہالہ۔ یہ پانچ بیٹیاں جب قریش کے پانچ مضبوط قبیلوں میں بیاہی گئیں تو ان قبیلوں سے عبد مناف اور اُسکے ان تین بیٹوں، مطلب، ہاشم اور عبد شمس کے تعلقات مزید مضبوط ہو گئے۔ نوفل کی ماں جائی بہن کا نام لایطہ تھا۔ دنیا کے ہر زندہ معاشرے کی طرح عرب قبائل میں بھی بیٹیوں، بہنوں کے اونچے خاندانوں میں بیاہ اور ماں جائے بھائیوں کی خوشحالی، سخاوت اور جسمانی مضبوطی بے پناہ قوت کا باعث ہوتی ہے۔

عبدالدار کی اولاد کی نسبت عبد مناف کی اولاد عرب کے ریگستانوں میں کہیں زیادہ معزز نکلی۔ جب عبدالدار اور عبد مناف دونوں فوت ہو گئے تو دونوں کی اولادوں میں کعبہ کی چابیوں اور مہمانوں کی میزبانی کے جملہ اعزازوں کے لیے رسہ کشی ہونے لگی۔

عبد مناف کی اولاد کے ساتھ کچھ دوسرے بھائیوں کی اولاد بھی آ ملی۔

عبد مناف کی پانچ بڑے قبیلوں میں بیاہی بہنیں بھی آ گئیں۔ ایک بہن خوشبو سے بھرا ایک بادشاہی پیالہ لیتی آئی۔ عبد مناف کے بیٹوں اور بیٹیوں کے علاوہ ان کے طرف داروں نے خوشبو سے بھرے پیالے میں ہاتھ ڈبوئے اور ہاتھوں سے غلاف کعبہ کو خوشبو لگا کے قسم کھائی کہ ہم ناانصافی سے کعبہ کے تمام اختیارات عبدالدار کو دیئے جانے پہ احتجاج کریں گے۔ لڑنا پڑا تو اکٹھے مل کے لڑیں گے اس وقت تک جب تک سمندر میں پانی ہے اور صحراؤں میں ریت۔ خوشبو سے ہاتھ بھر لینے کی وجہ سے ان سارے گھرانوں کا نام "مطیبین" پڑ گیا۔ بنو اسد، بنی زہرہ، بنی تیم اور بنو حارث انہی کے ساتھ تھے۔

اُدھر عبدالدار کی اولاد کو بھی اپنے چچیرے بھائیوں کے اکٹھ کی بھنک پڑ گئی۔

شاید انہیں خوشبو نہ ملی یا وہ دوسرے گروہ پہ نفسیاتی دباؤ ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ پیالے میں خوشبو کے بجائے کسی اونٹ یا گائے کا خون بھر کے کعبہ کے صحن میں آ بیٹھے۔ خون سے بھرے ہاتھ کی انگلیاں وہ غلاف کعبہ سے کیسے پونچھتے، انہوں نے خون آلود اپنی اپنی انگلیاں زبانیں نکال کے چاٹ لیں اور منہ کھول کے شور مچا دیا کہ ہم کعبے کی تولیت کسی دوسرے کے ہاتھ نہ جانے دیں گے۔ عبدالدار کے علاوہ مخزوم، عدی، سہم

حج اور کئی دوسرے قریشی قبائل کی اولاد بھی ان میں آ بیٹھی اور ان کے خون بھرے پیالے میں انگلیاں ڈبو کے چاٹنے لگی۔ قصّی کے پوتوں میں دو گروہ ہو گئے۔

خوشبو میں ہاتھ ڈبو کے حلف اٹھانے والے احلاف اور مطیبین مشہور ہوئے تو خون چاٹنے والے لعقۃ الدم کہلانے لگے۔

دونوں طرف جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ قصّی کی اولاد میں رسہ گیری شروع ہوئی تو پورے قبائل قریش تقسیم ہو گئے۔ تلواریں میانوں سے باہر نکل آئیں۔ پتھر کی سلوں پہ ان کی دھار تیز ہونے لگی۔ ڈھال کا ان صحرائی قبائل میں رواج کم تھا۔ انہیں دفاع کا ہوش نہیں ہوتا تھا۔ حالت جنگ میں وہ صرف ایک ہی ہنر سے واقف تھے۔ بے جگری سے لڑنا، اس وقت تک لڑنا جب تک موت ان میں فیصلہ نہ کر دے۔

مکہ کی مقدس احترام بھری بستی میں سراسیمگی پھیل گئی۔

گدھ اُوپر آسمان کی وسعتوں سے کچھ نیچے اُتر کے ان کے اوپر منڈلانے لگے۔ وہ بستی جہاں دُور طے شدہ حدود تک کسی بھی ذی روح کا خون بہانا منع تھا وہاں بھائیوں کی اولاد نے ایک دوسرے کے لیے تلواریں سونت لیں۔

مکے پہ جنگ کے بادل منڈلاتے دیکھ کے کچھ امن پسند لوگوں کو قصّی یاد آنے لگا۔ جس نے قریش کے تمام قبائل کو صحراؤں سے نکال کے مکہ کی بستی میں احترام والے گھر کے گرداگرد وقار سے آباد کیا تھا۔ خود طویل عمری کے بعد فوت ہو کے حجون میں دفن ہوا تھا۔ قصّی کے حجون میں دفن کے بعد حجون ہی اشراف مکہ کا پسندیدہ قبرستان ہو گیا تھا۔ اور اب اولاد قصّی میں پڑی دراڑوں کو دیکھ کے انہیں حجون میں ان گنت قبریں کھلنے کو بے چین نظر آتی تھیں۔ انہیں قصّی کی وفات پر اس کی بیٹی تخمرہ کا لکھا مرثیہ یاد آ گیا۔

تخمرہ لکھتی ہے:

”سونے والے رات سور ہے تھے کہ
موت کی خبر دینے والے برے آدمی نے
دروازہ کھٹکھٹایا
اور
قصّی کے مرنے کی خبر دی
اس قصّی کے جانے کی
جو قوم کا سردار تھا
رہبر تھا
سخی اور کریم تھا
خبر دینے والے نے اس شخص کے مرنے کی
خبر دی
جو خاندان لوی میں مہذب تر تھا

اس خبر نے میرے آنسوؤں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔
آنسوؤں کو پرو کے بنی لڑی کو توڑ دیا۔
بکھیر دیا
میرے اندر رنج بھر گیا
نیند اچاٹ ہو گئی۔
بے قراری ایسے بڑھی جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔"
مکہ کی بستی میں اولاد قصی کے سرہانوں پہ موت کا سانپ سر اٹھائے ناچ رہا تھا۔ پورے علاقے میں بھائیوں کی اولاد میں آپس کی دشمنی کے باعث خوف کی لہر پھیلی تھی۔
عبد مناف کی اولاد میں بہر حال ہاشم کو امید تھی کہ شاید لڑائی ٹل جائے۔
مکہ کی پاور بستی میں کوئی خون خرابہ نہ ہو۔
ایسا ہی ہوا۔
کچھ قبائل ثالثی کروانے آ گئے۔
خوشبو کے پیالے سے غلاف کعبہ معطر کرنے والوں اور خون چاٹنے والوں کے درمیان لڑائی کے بجائے حالت امن میں فیصلہ ہو گیا۔
فیصلہ کرنے والے ثالثوں نے دونوں فریقوں کے مابین نزاع بنے کعبے کی تولیت کے مسئلے کو جانچا۔
دونوں گروہوں کی معاشرتی قدر و قیمت کا جائزہ لیا۔
ان کے مال و اسباب، اولاد، عادات، سخاوت اور قربانی کے جذبوں کو پرکھا اور فیصلہ دے دیا۔
فیصلہ یہ دیا کہ تولیت کعبہ کی آدھی ذمہ داریاں ایک فریق ادا کرے، آدھی دوسرا۔
عبد مناف کی اولاد میں سخاوت، حلم اور ایثار کی بھرمار دیکھی تو خدا کے گھر آنے والے مہمانوں کی تمام تر ذمہ داری انہیں دے دی۔
انہیں کہا تم حاجیوں کو پانی پلانا اور کھانا کھلانا۔
یوں سقایہ اور رفادہ جیسی عظیم خدمات خانوادہ عبد مناف کے سرپنچ ہاشم کو مل گئیں
اور دکھاوے کی چوہدراہٹ، جنگ و جدل میں جھنڈا اٹھا کے چلنا، میدان جنگ میں دوڑتے گھوڑوں کی سربراہی کرنا اور کعبے کے دروازے کو کھولنے بند کرنے کی ذمہ داریاں اولاد عبدالدار کو دے دیں۔ دارالندوہ کا کھلا کمرہ پوری اولاد قصی کے لیے مشترک کر دیا کہ سارے عمائدین قریش ادھر آئیں بیٹھیں، مشاورت اور فیصلے کریں۔
فیصلہ ہو گیا تو اس کی تعمیل ہوئی۔
جنگ ٹل گئی مگر دلوں کے شیشوں میں بال آ گیا۔

☆☆☆☆☆

نشیدِ توحید : عباس علی شاہ ثاقب

عباس علی شاہ ثاقب کا ایم فل کا مقالہ ''پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری'' ہے۔ انھوں نے خاص طور پر حمدیہ قصیدے کی صنف کو موضوع تحقیق بنایا ہے اور اس کی تفصیلات اس مقالے میں فکری بصیرت سے پیش کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلامی روایات کا جس بھی ملک اور جس زبان سے بھی تعلق رہا ہے اس کی شعری روایت میں حمد کا ایک خاص حوالہ بنتا ہے۔ اردو میں حمد کے قدیم ترین نمونے آغاز اردو میں ہی ملتے ہیں۔ ابتدائے اردو میں حمد جکری کے طور پر ہمارے سامنے آئی جیسے امیر خسرو کے زمانے میں لوگ مختلف کام کے آغاز میں چھوٹے چھوٹے ورد کرتے تھے ان کی چھوٹی چھوٹی صنفیں جنھیں جکریاں کہتے ہیں اس میں حمد کے ابتدائی نمونے بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح شیخ باجن کی جکریوں کے نمونے بھی دستیاب ہیں۔

اللہ سیتیں جے کوئی ہوئے
اللہ اور جگ اس کا ہوئے
من مراد گھر بیٹھے پاوے
اس کو مار نہ سکھے کوئے
کوئی اللہ سیتیں اللہ کسے
سہتیں باجن درویش پر مناوے
اللہ ہوں کو چہ سہتیں بیٹھی بھکیاوے

لیکن بعد میں حمد باقاعدہ صنف کے طور پر سامنے آئی۔ عربی اور فارسی میں اس کی قدیم روایت موجود تھی لیکن اردو میں قصیدے کا زیادہ تعلق زبان دانی کے ساتھ ہی رہا۔ تاہم حمدیہ قصیدے بھی ساتھ ساتھ ہوتے رہے۔ قصیدے پر موضوع کے علاوہ ہیئتی پابندی بھی عائد ہوتی ہے جو اسے الگ پہچان اور شناخت عطا کرتی ہے۔

ہمارے ہاں حمد کی روایت جو موجودہ دور میں نظر آتی ہے اس کا زیادہ تعلق غزل کے ساتھ ہے لیکن تاہم حمدیہ قصیدے بھی لکھے

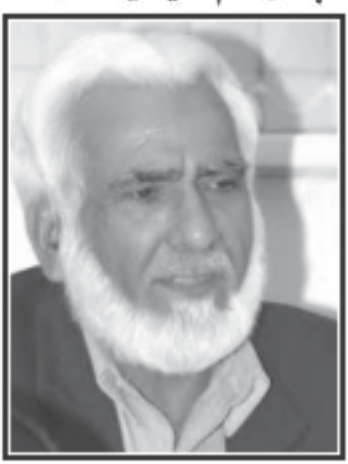

ریاض مجید

گئے۔ عباس علی شاہ ثاقب نے بڑی عقیدت مندی اور محنت سے ان آثار کا سراغ لگایا ہے جو قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں خاص طور پر اِس زمانے میں ہمیں ملتے ہیں۔ حمد خدا کی تعریف ہے اور خدا کی تعریف کی بے شمار شکلیں ہیں اس کے بارے میں اگر سراغ لگایا جائے تو اردو میں جتنی بھی صنفیں ہیں مثلاً ہائیکو، رباعی، قصیدہ، قطع، مستزاد اور نظم کی مختلف شکلیں (آزاد نظم، معریٰ نظم) وغیرہ میں ہمیں حمد کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں لیکن قصیدے کے طور پر اس کا چلن کم کم ہے مگر اس تحقیقی کاوش کے بعد پھر سے اس رجحان کے فروغ کی امید کی جا سکتی ہے لیکن پھر بھی گزشتہ پچاس ساٹھ سالوں میں قصیدے اور حمد کی بہت ساری شکلیں ہمارے ساتھ آئی ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب حمدیہ مجموعے ہمارے سامنے اشاعت کے بعد نظر آئے جس کا آغاز نذرِ خدا سے ہوتا ہے۔

عباس علی شاہ کا خاص کمال یہ ہے کہ انھوں نے قصیدے کی شکل میں حمدِ ربِ ذوالجلال کا سراغ لگایا ہے جو یقیناً ''پاکستان میں اردو حمدیہ قصیدہ نگاری'' کی تاریخ میں ایک قابلِ قدر اضافہ اور اثاثہ ہے۔ انھوں نے ہر دور کے قصیدے کے بدلتے حالات اس کے رجحانات اور جہات کو محسوس کیا ہے۔ اپنے طور پر یہ ایک بہت بڑا کام ہے۔ بے شمار ریسرچ اسکالرز مختلف اصناف پر مقالات لکھتے ہیں لیکن یہ ان کی سعادت مندی ہے کہ حمدیہ قصائد کے ساتھ ان کی دل چسپی مذہبی گھرانے سے تعلق کے باعث ہے۔ وہ خود بھی ایک عمدہ شاعر ہیں۔

ان کی غزل اور تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے جو حمدیہ قصیدے کے موضوع کو چنا ہے اور اس پر تحقیق کی ہے یہ اُردو حمدیہ قصیدے کی روایت میں ایک بڑا عمدہ اضافہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اُردو حمدیہ قصائد پر جب بھی کام ہوگا ان کے مقالے کو اولین دستاویز کی حیثیت حاصل رہے گی۔ جیسے کہ اہلِ علم جانتے ہیں کہ حمد بہت بڑا موضوع ہے اس کا احاطہ کسی ایک مقالے میں ممکن نہیں ہے اس پر ماضی میں کام ہوا ہے اور مستقبل میں بھی جاری رہے گا لیکن ایم فل کی سطح پر یہ ایک بہت بڑے کام کی بنیاد بن سکتا ہے اس پر آگے چل کر پی ایچ ڈی کی عمارت بھی استوار کی جا سکتی ہے اس میں عباس علی شاہ ثاقب کی دل چسپی بھی ہے وہ اس مقالے کے ہر باب میں بخوبی نظر آتی ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے کے حمدیہ قصائد اور بعد کے قصائد کا انھوں نے عہد بہ

عہد جائزہ لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ یہ کام مکمل ہو گیا۔ یقیناً اس کی مزید فکری جہات پر کام کیا جا سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ عباس علی شاہ ثاقب خود ہی جب پی ایچ ڈی کے مقالہ کا انتخاب کریں تو اس کی مزید فکری جہات آشکارا کریں گے۔ تاہم موجودہ شکل میں جب یہ مقالہ کتابی شکل میں ہمارے سامنے آ رہا ہے تو یہ بہت ہی خوش آئند ہے یوں وہ صنف جو پس منظر میں چلی گئی تھی وہ ہمارے سامنے آ رہی ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ گزشتہ سو دو سو سال میں غزل کی صنف ہی مقبول رہی ہے اور غزل کے مضامین ہی ہمارے سامنے آتے رہے۔

اب جو اِک دورِ نو شروع ہوا ہے تو 1975 کے بعد جس میں حمد، نعت، منقبت اور سلام کی تازہ روایت ہمارے سامنے آئی ہے اس حوالے سے یہ مقالہ ایک اہم مطالعہ پیش کرتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ عباس علی شاہ ثاقب اپنی دل چسپی سے اس موضوع کے ساتھ قلبی وابستگی رکھیں گے اور آنے والے زمانے میں اس میں اضافہ بھی کریں گے۔ تازہ حمد جو ہیئتی تنوع کے ساتھ لکھی جا رہی ہے اس میں بہت ساری صنفیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی صنف قصیدہ سے حمد کو دیکھا ہے تو مجھے یقین ہے کہ آنے والا وقت اس کی کاوش کا معترف ہوگا۔ اردو کی قدیم شعری روایت، صنفِ قصیدہ اور خاص طور پر حمدیہ قصائد کے تناظرات کا جائزہ انھوں نے فلسفہ توحید کی روشنی میں زینتِ قرطاس کیا ہے۔

ضخامت کی دقت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے انھوں نے اختصار کے ساتھ توحید کے فلسفیانہ مباحث اور جہات کا اجمالی تعارف بھی فکری بصیرت سے پیش کیا ہے۔ قرآن مجید کی آفاقی تعلیمات اور توحید کے تقاضوں کو فکری آب یاری کا ذریعہ بنایا ہے۔ انھوں نے دلائلِ توحید، ردِّ شرک اور نصوصِ قرآن مجید سے کشید کردہ موضوعات کو اسلوبِ نگارش کے توسط سے ایک نہج کی ترویج کا وسیلہ بنا کر پیش کیا ہے۔

مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ مقالہ صرف ان کے لیے نہیں بلکہ ہماری یونی ورسٹی کے لیے بھی ایک بھرپور حمد نگاری اور حمدیہ قصیدہ نگاری کے لیے تحقیقی پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

میں عباس علی شاہ ثاقب کو ان کے مقالے کی کتابی صورت میں اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر ابرار عمر اور دبستانِ اسلام آباد [ایک مختصر تاثر]

اسلام آباد کے نظم گو شعرا کی ادب سے وابستگی جس شوق و شغف اور زور شور سے جاری و ساری ہے اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن کیا محض شوق ہونا کافی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ اصل بات پیدائشی شاعر ہونا ہے۔ ان شعرا میں سے علی محمد فرشی، نصیر احمد ناصر، ارشد معراج اور ڈاکٹر وحید احمد کے بارے میں میری دوٹوک رائے ہے کہ یہ چاروں بہت خوش اخلاق، ذاتی سطح پر انتہائی ملنسار اور مجلسی شخصیات ہرگز ہرگز فطری شاعر نہیں ہیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ میری ذاتی رائے ہے اور ادبی رائے ہے جو میرا حق ہے اور کسی کو بھی اس سے اختلاف ہوسکتا ہے میرے لیے سب کا نقطہ نظر قابل احترام ہے۔ میرا اس حوالے سے استدلال یہ ہے کہ نصیر احمد ناصر اور علی محمد فرشی کو بطور شاعر اسٹیبلش ہونے کے لیے ادبی رسالوں و روابط کا سہارا لینا پڑا جبکہ ڈاکٹر وحید احمد کو مسلسل پبلک ریلیشننگ اور مستقل بنیادوں پر مارکیٹنگ کی مدد لینی پڑ رہی ہے۔ جبکہ ارشد معراج شاگردوں کے سامنے بلبلا بلبلا کے تھک گیا ہے مگر تاحال خود کو شاعر اسٹیبلش نہیں کر سکا۔ ایک اور مشاہدہ جو میری اس رائے کو تقویت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے حوالے سے ادبی سرکلز میں جب بھی کوئی توصیفی یا دفاعی عمل یا ردعمل سامنے آیا ہے تو یہ عمل یا ردعمل پیش کرنے والوں کی اکثریت ان کے بنی فشریز پر ہی مشتمل ہوتی ہے - ذاتی مراسم، سماجی تعلقات اور کھانے پینے، بیٹھنے اٹھنے سے لیکر چھپنے چھپانے کی بنیادوں پر شاعر بن بیٹھنا بالکل ایک اور معاملہ ہے اور شاعری کا قدرت کی طرف سے ودیعت ہونا اور لوگوں کے قلب و ذہن کو مسخر کر لینا بالکل ہی مختلف بات ہے۔

اسی شہرِ دربار سرکار میں رہنے والا ایک دیوانہ شاعر ڈاکٹر ابرار عمر بھی ہے جس کا اوڑھنا بچھونا شاعری اور موسیقی ہے - وہ اپنے

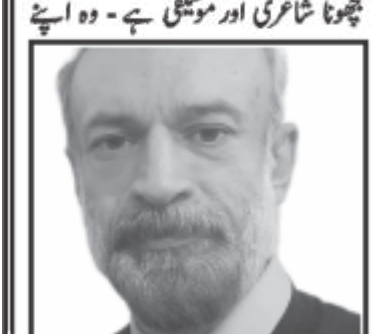

فرحت عباس شاہ

پروفیشن میں نہایت قابل، ذمہ دار اور صاحب دیانت ہونے کے ساتھ ساتھ تمام کا تمام شاعر ہے۔ وہ نظموں کو محض اپنے خیال سے چُھو کے شاعری بنا دیتا ہے، مصرعوں کو کیفیت کی زبان عطا کرتا ہے، شعروں کو آنسوؤں کی سپرداری میں ہواؤں کے حوالے کرتا ہے۔ اس کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے قاری کے ساتھ ہنسنے اور رونے کا ہنر آتا ہے۔ میرا آپ کو کھلا چیلنج ہے آپ تحقیق کرلیں کہ فرہاد ترابی، عائشہ مسعود اور ڈاکٹر ابرار عمر کے علاوہ اسلام آباد کے افتخار عارف، اختر عثمان اور متذکرہ بالا احباب، کرام اور سورماؤں میں سے کسی نے بھی اگر ملک اور عوام کی حالت زار پر ایک شعر بھی کہا ہو تو ہم انھیں شاعر تسلیم کرلیں۔ ان سے اچھی تو نجیبہ عارف نکلیں جنھوں نے سرکاری ادارے میں بیٹھ کر ملک کی حالتِ زار پر بارہا شدید کرب کا اظہار اور احتجاج ریکارڈ کا حصہ بنایا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر ابرار عمر جیسے وطن کی بے وطنیت اور انسانوں کے ساتھ ہونے والے غیر انسانی برتاؤ پر ہمہ وقت نوحہ کناں ہے۔ ابرار عمر کے درج ذیل اشعار تو عوام کے دلوں کی ایسی ترجمانی کرتے ہیں کہ بے اختیار شاعر کا ماتھا چوم لینے کو دل کرتا ہے۔

خواب میں آ کے یہ قائد نے کہا ہے مجھ سے
دفتروں سے مری تصویر ہٹا دی جائے

شہر کو راکھ بنائے گا تو پھر جائے گا
آخری گھر بھی جلائے گا تو پھر جائے گا

اس کے منشور میں شامل ہے ہراساں کرنا
خوف ہر دل میں بٹھائے گا تو پھر جائے گا

نہیں ابرار نہیں وہ نہیں جانے والا
اس کے جیسا کوئی آئے گا تو پھر جائے گا

شہر برباد تو آباد نہیں ہو گا کبھی
اب نیا شہر بنانے کی ضرورت سوچو

وقت کے ساتھ ساتھ شاعر کی تعریف بدل چکی ہے۔ اب سماجی و انسانی احساس اور ادراک کی ذمہ داری ہوگی تو شاعر ہوگا ورنہ جعلی مصرعے بازی، بے حسی اور مفادات کی دوڑ جیسی موذی امراض کا شکار جتنی بڑی بڑی ٹوپیاں لگالے صاحبان علم وادراک کی نظر میں شاعر قرار نہیں پائے گا۔ چھوٹے چھوٹے ادبی گروہوں کی نظر میں استاد کہلانے والے شعرا کی بے تاثیر اور بے برکت منظوم تحریریں تاریخ کی اسی چھابے میں پھینک دی جاتی ہیں جسے ردی کی ٹوکری کہا جاتا ہے۔

شاعر اور خصوصاً نظم کے شاعر کی تو پہلی تعریف

ہی یہ ہے کہ وہ ، اعجاز رضوی ، ڈاکٹر یونس خیال، شفیق احمد خان، مظہر حسین اختر اور ڈاکٹر ابرار عمر جیسا صاحب احساس و شعور ہوگا۔ جس کی شاعری بغیر کسی سہارے کے قاری کے دل کی انگلی تھام کر ساتھ لے چلنے کی طاقت رکھتی ہوگی۔ جیسا کہ ابرار عمر کی یہ نظم۔

"بدن ساحل پہ تھا میرا"

سمندر چیختا تھا
اور ہوائیں بین کرتی تھیں
کوئی وارفتگی خواہش کشش کا
استعارہ اس کی باتوں میں نہیں تھا
ساتھ تھی میرے
مگر وہ ساتھ کب تھی
زہر میں ڈوبے ہوئے فقروں نے
اس کی کفریہ آنکھوں کو
میرے جسم پہ گاڑھا ہوا تھا
میں جسے ملنے گیا تھا
وہ کہاں تھی
اب وہ شاید مر چکی تھی
اس نے بازاری تمناؤں سے مل کے
اس کو مطلق مار ڈالا تھا
بدن ساحل پہ تھا میرا
مگر دل دور گہرے پانیوں میں اخری
سانسوں میں تھا
میں نے سمندر سے بھی اونچا چیختا چاہا
ہواؤں سے بھی زیادہ شور اگلا
اس کے بالوں کی گھٹائیں
اپنی مرضی کے فلک پر اڑ رہی تھیں
میرے پاکیزہ سنہری آئینوں میں پلنے والی
انتہائی راستوں میں کھو گئی تھی
میرا دل تو
اس کی منزل کا فقط پہلا پڑاؤ تھا
محبت کی زمیں پر ہجر کا
بے انت لمبا اور گہرا اک کٹاؤ تھا
جہاز اس بار تیزی سے
مجھے میری طرف لایا
مسافر لاؤنج سے باہر
تلاش گم شدہ کا اشتہار
آنکھوں میں چبھتا جا رہا تھا
اور میں روتا ہوا
بستی میں داخل ہو رہا تھا

یہ بہت اچھا ہوا ہے کہ ادرا کی تنقیدی تھیوری کے آنے سے خالص اور نا خالص تخلیق کاروں کے درمیان فرق کیا جانے لگا ہے ورنہ اب تک تو جس کا جی چاہتا ہے کاٹھ کی کتابیں اور کباڑ کی کانفرنس بنا کے خود کو شاعر اور ادیب کے مرتبے پر فائز بھی فرما لیا۔ عہد حاضر کا سب سے بڑا علمی اور ادبی کارنامہ یہی ہے کہ اس دور میں حقیقی اور مصنوعی ادیب کے درمیان فرق واضح کیا جانے لگا ہے۔

☆☆☆☆☆

مرے جن نکل گئے

شکر گزار ہوں، ڈاکٹر حامد عتیق سرور صاحب کا کہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ "مرے جن نکل گئے" ان کے دستِ مبارک سے موصول ہوا۔ زیرِ نظر شعری مجموعہ طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سے مزین ہے جس میں آپ کی شعری سنجیدگی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے جب کہ آپ نے خود اس مجموعہ پر "غیر سنجیدہ شاعری" لکھا۔ اگر دیکھا جائے تو مزاحیہ شاعری کے حوالے سے یہ بھی ایک خوب صورت اور ملفوف طنز ہے۔ اس سے پیشتر آپ کی مزاحیہ شاعری کا اوّلین مجموعہ "اٹھارویں کا چاند" بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے، پہلے تو میں چاہوں گا کہ اس اوّلین مجموعہ کے رنگ واضح کرنے کے لیے چند اشعار آپ کی خدمت میں پیش کروں جس سے قاری کو اس مجموعہ کے اعلیٰ شعری معیار کا بھی اندازہ ہو سکے:

زوجہء دور کو موجود ہی سمجھا جائے
جادہء عشق کو مسدود ہی سمجھا جائے
مل کے جس طرز کی حرکات کیا کرتے ہیں
مرد کی جمع کو مردود ہی سمجھا جائے
مولوی جی کو اٹھا لے گئے خفیہ والے
اس کو آبادی کی بہبود ہی سمجھا جائے
چند ساعت ہمیں مقصود ہی سمجھا جائے

.....

اب آتے ہیں دوسرے شعری مجموعہ "مرے جن نکل گئے" کی طرف اور ایک نظر ڈالتے ہیں اس مجموعہ کے ٹائٹل کی غزل کے چند اشعار پر کہ اس حوالے سے کوئی ابتدائی رائے بن پائے، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہاں اے حریم ناز، مرے جن نکل گئے
عشووں سے احتراز، مرے جن نکل گئے

رانا سعید دوشی

وہ بے وفا تھی چھوڑ کے لندن نکل گئی
جیسے اڑا جہاز مرے جن نکل گئے

مجنوں بھی نوکِ خار سے صحرا کی ریت پر
یوں تھا رقم طراز، ''مرے جن نکل گئے''

مشکل سے مانگ تانگ کے لائے تھے چار جن
دو دن میں بخت ساز، مرے جن نکل گئے

سب تاک جھانک نامہ و پیغام برطرف
بس روزہ و نماز، مرے جن نکل گئے

.....

غزل کی ردیف، ''مرے جن نکل گئے'' ایک نئی معنویت اور تفنن کی فضا کے ساتھ اس طرح واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ جن نکلیں یا نہ نکلیں، وہ جو پنجابی میں کہتے ہیں کہ ''ہاسا نکل گیا'' وہ ضرور نکلتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی مزاحیہ شاعری کا وہ حسن ہے جو اسے خاص اعتبار دے کر معروف کرتا ہے۔
ڈاکٹر حامد عتیق سرور نے نہایت سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے منفرد اسلوب میں معیاری مزاحیہ شاعری کے لیے اپنے مزاج کے مطابق ذرا جدا راستہ چُنا اور اس پر بڑی شان سے رواں دواں نظر آئے ہیں، ان کے اسلوب کے منفرد اور معتبر ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ وہ ایک صاحبِ مطالعہ شخصیت ہیں اور عربی، فارسی، اردو، پنجابی، انگریزی ادب سے ایک مہذب سوچ کے ساتھ اس درجہ وابستگی نے انہیں ایک خاص مقام عطا کیا ہے۔

کچھ ایسی دھند کہ امکانِ او جلوہ نہ شد پیدا
ہمیں رستہ نہیں ملتا، بہ او حیلہ نہ شد پیدا

اگرچہ خانہ آبادی کا چوتھا سال ہے شاید
ہزار امروز و فردا شد و لے ''کاکا'' نہ شد پیدا

تا سارے رقیبوں کی خباثت پہ نظر ہو
مجنوں درِ لیلیٰ کا گدا شد، چہ بجا شد

دنیا سے توقع ہے، ملے عزت و تکریم
پلّے نہیں دھیلا نہ ٹکا شد، چہ بجا شد

جب اور کسی نے بھی کہیں گھاس نہ ڈالی
''دلدار مقیمِ دل ما شد، چہ بجا شد''

.....

آپ کی مزاحیہ شاعری، پہلی نظر میں بلند آہنگ قہقہوں کے بجائے صرف مسکراہٹ بکھیرتی ہے اور جب ان اشعار کی تہہ داری قاری پر آشکار ہوتی ہے تو ہو سکتا ہے کہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے قاری کی آنکھوں سے اشک بھی جاری ہو جائیں، مگر قاری کے یہ اشک باہر کی طرف نہیں بلکہ اندر کے طرف گرنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے:

ہم اپنے دل کے ہاتھوں اس قدر مجبور بیٹھے ہیں
گلی میں آتے جاتے سارے رکشے گھور بیٹھے ہیں

یہ درویشانِ خوش پوشاں جو بالکل کچھ نہیں کرتے
امورِ مملکت پر دیر سے مامور بیٹھے ہیں

کہیں اک رند نے مستی میں پھینکی چاند پر بوتل
قریبی تین تارے، رات سے مخمور بیٹھے ہیں

طلسمِ سامری ہے یہ کہ پاکستان ہے شاید
یہاں ہاتھی شجر پر، فرش پر لنگور بیٹھے ہیں

.....

زیرِ نظر شعری مجموعہ پر ایک جامع مضمون تو مجھ پر قرض ہے مگر سرِ دست میں چاہوں گا کہ اس کے متنوع موضوعات پر کچھ اشعار کا انتخاب کر کے قاری کے لیے ایک خوش نما شعری منظر نامہ پیش کر پاؤں لہٰذا شعری انتخاب کو ترجیحی بنیادوں پر پیش کرنے پر اکتفا کروں گا تاکہ قاری پر تفنن کے یہ ذائقے بھی واضح طور پر کھل پائیں:

وعدہ کیا تھا اس نے، ملے گی، نہیں ملی
بیٹھا رہوں، رقیب کے گھر جاؤں، کیا کروں

سنتے ہیں اس کو چھوڑ دیا ہے کھڑوس نے
کوچے میں اس کے بار دگر جاؤں، کیا کروں

.....

پئے علاج کوئی چارہ گر لگے گا نہیں
لگے گا، لگنے لگے گا، مگر لگے گا نہیں

رقیب لے کے نیا پیرہن ولایت سے
پہن تو لے گا، مگر معتبر لگے گا نہیں

لیا ہے داخلہ کالج میں مہ رخوں کے لیے
پڑھے گا پانچ برس ڈاکٹر لگے گا نہیں

لگا کے کھال اسے زیبرا بنایا ہے
جو چپ رہا تو زمانے کو خر لگے گا نہیں

.....

زن مریدی، بنی آدم کا اجارہ تو نہیں
زیرِ پر دیکھا ہے اک مرغ کو انڈہ رکھے

یہ جو تھوڑی سے خوشامد سے پگھل جاتا ہے
میرا مالک اسے حاکم، مجھے چمچا رکھے

.....

کچھ اس کے بحر کی موجوں کو اضطراب تو دے
عدو کو میری طرح چار دن خراب تو دے

یہ دس ہزار تھے، آلو، پیاز، گھی لا کر
بتایا گر نہیں دیتا نہ دے، حساب تو دے

کہا ہے خلد میں غالب نے کل فرشتے کو
کہ خانہ ساز سہی، ڈھنگ کی شراب تو دے

.....

ہمیں گلاب پکارو تو تم گلِ نرگس
جو لال بیگ کہو گے تو کیکڑے ہو تم

گلہ رقیب کا ہم نے کیا تو فرمایا
اگر وہ دل ہے مرا، جان! پھیپھڑے ہو تم

.....

عجب خدشہ سا رہتا ہے کبھی کوئی کبھی کوئی
کہ اس پہ مرتا رہتا ہے، کبھی کوئی کبھی کوئی

ترا محبوب ہونا جانِ من سرکاری عہدہ ہے
جہاں افسر بدلتا ہے، کبھی کوئی کبھی کوئی

....

لمبی بحروں میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

چھوڑ جانے کی دھمکی نہیں کارگر، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے
اس پہ پہلے ہی مرتا ہے سارا نگر، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

قیس پاؤں سے سرتک اٹا ریت میں اور رانجھا کسی بھینس کے کھیت میں
جب ملے تو ہوئی گفتگو مختصر، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

....

عشق دو ہی ملے، میں نے دونوں کیے، ایک لاہور میں، اک کراچی کیا میں تھا پنجاب کا، پھر مہاجر ہوا، میں ماہیا لکھا، میں غزلیں کہیں اس سے الفت تو تھی، پر وہ پڑھتی رہی، پھر ولایت گئی، ڈھونڈلی نوکری میں نے ایم اے کیا، لیکچرر لگ گیا، اس کے لڑکا ہوا، میں نے غزلیں کہیں۔ ان کے زیرِ نظر شعری مجموعہ میں ایک باریک نہایت عمدہ اور سردی کی لہر میں لپٹا ہوا مزاح، چہروں پر مسکراہٹیں بکھرتا ہوا کچھ اس طرح نمودار ہوتا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ میں اسے "میر عالمی" غزل کا نام دوں، اشعار ملاحظہ ہوں:

اب یہی عزم ہے، چاہے تو قیامت گزرے
ہم نہیں بدلیں گے بنیان، بہت سردی ہے

چاند پہ جھک کے کسی ابر نے سرگوشی کی
گھر میں رہتے ہیں مری جان بہت سردی ہے

جیب میں ہاتھ دیئے ایک سپاہی بولا
آہ! کیسے کروں چالان بہت سردی ہے

سرد ہاتھوں سے چھوا جب تو تڑپ کر بولے
بھاڑ میں جائے یہ رومان، بہت سردی ہے

....

اب ذرا تھوڑا سا مختلف رنگ ملاحظہ فرمایئے اور سر دھنیے:

جج کو طوطے نے کہا، عالی جناب!
نام میں "ت" ہے مرے، طوئے نہیں

....

حالتِ نزلہ و زکام میں ہیں
دستِ قدرت کے انتقام میں ہیں

"بے" نکلتا ہے گر جو بولیں "میں"
بکریوں کی دعا سلام میں ہیں

چھینک سے پیشتر وہ عالم ہے
گویا تلوار ہیں، نیام میں ہیں

اسی طرح مزید خوب صورت اور گہرے شعر ملاحظہ فرمائیں:

ارادہ حج کعبہ کا کیا ہے
ٹکٹ، بشلک کے رستے لی گئی ہے

ترا درشن ہے یا آٹے کا تھیلا
جو خلقت اس طرح سے ٹوٹتی ہے

مفاعیلن، مفاعیلن، فعولن
سخن بھی بحریہ کی نوکری ہے

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
عقدِ شیریں میں لگاتا کرسیاں یہ آدمی

....

یار کے عشاق کی فہرست سے
ملک کی مردم شماری کم نہیں

....

ہم کو ٹھکرائے اگر، غیر کے گھر میں تجھ سے
گول روٹی نہ بنے، ڈھنگ کی چائے نہ بنے

....

وہ جو سردیاں تھیں، سو احتیاط سے کٹ گئیں
یہ جو گرمیوں کے زکام تھے، مجھے کھا گئے

جو حلال تھے سبھی جانور، وہ میں کھا گیا
جو درند مجھ پہ حرام تھے، مجھے کھا گئے

....

حورانِ خُلد رند کی بانہوں میں دیکھ تاک
زاہد نے ہاتھ سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

....

اسی طرح کے مزید مزاحیہ رنگ، جن میں آپ نے فارسی کی شعری روایت سے تفنن کی ایک منفرد اور خوب صورت فضا بنائی ہے یہ رنگ آپ کی فارسی شعری اور ادبی وابستگی کی غماز ہونے کے ساتھ خود بتاتی ہے کہ معیاری مزاحیہ شاعری کیسی ہوتی ہے، یہ دھنک رنگ بھی ملاحظہ فرمائیں:

تا بہ زلفِ یار، دستِ نارسا برداشتم
نیز اپنے گنج پر ٹھنڈی ہوا برداشتم

ہر کجا رفتم ترے واقف مجھے ملتے رہے
جانم ای عاشق پریشاں از کجا برداشتم

ایک جوڑے سے جو پوچھا زندگی کیسی رہی؟
ایک گوید، میں تو خوش ہوں، دوسرا "برداشتم"

....

زیرِ نظر شعری مجموعہ، بک کارنر جہلم سے شائع ہوا ہے، بک کارنر جہلم میں ہونے والی اس مجموعہ کی تقریبِ رونمائی میں جناب اصغر ندیم سید نے یہ جملہ کہا کہ جن تو نکل جانا اچھی بات ہے، مگر سارے جن نہیں نکلنے چاہیے کچھ باقی بھی رہنے چاہیے۔
مجھے ان کا یہ جملہ بہت اچھا لگا اور مجھے یقین ہے کہ قارئین بھی اس سے متفق ہوں گے:

آنگن ہے گھر کا اس پہ یہ اقبال کا کلام
مرغے کی بانگ سنتے ہیں بانگِ درا کے ساتھ

....

آپ کی شاعری پڑھ کر سب سے بڑی بات، جو سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ آپ نہ تو طنز و مزاح کا اخروٹ کسی کے سر پر رکھ کر توڑتے اور نہ ہی بلاوجہ زبان(Language) کے کان مروڑتے ہیں۔
اسی بنا پر میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر "ڈاکٹر حامد عتیق سرور صاحب" کی زیرِ نظر مزاحیہ شاعری کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے، عہدِ حاضر کی مزاحیہ شاعری پر ایک نظر ڈالی جائے تو آپ کا یہ وصف نمایاں ہو کر آپ کی مزاحیہ شاعری کو نہایت معتبر مقام پر فائز کرتا نظر آتا ہے میں ڈاکٹر حامد عتیق سرور صاحب کو ان کی اس کاوش پر مبارک پیش کرتے ہوئے کہنا چاہوں گا کہ "ڈاکٹر حامد عتیق سرور صاحب! آپ ہمارا فخر ہیں۔ اللہ آپ کی شاعری کو مزید برکتوں سے نوازے:

☆☆☆☆☆

راز ہستی..... پختہ کہانی کار [زرقا فاطمہ]

کہانی بننے اور پنپنے کا پہلا باغیچہ ماں کی آغوش ہے۔ وہ پہلے پہل سنی سنائی اور گھڑی گھڑائی کہانیاں سناتی ہے اپنی ماتا کا فرض جان کر۔۔۔ کہانی تربیت کرنے لگتی ہے۔ مزاج کے اتار چڑھاؤ کہانی کے پہلوؤں سے بگڑنے سنورنے لگتے ہیں۔ ماں جو عورت کا ازلی اور مجسم رنگ ہے وہ اسی رنگ میں سرتا پا رنگی ہوئی کہانیاں اس فانی کائنات سے چننے لگتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ضرورت اور رائے کی آمیزش کر کے نئے موڑ دے لیتی ہے۔

کہانیوں کی کتاب ''راز ہستی'' زرقا فاطمہ نے مجھے عنایت کی وہ مجھے اس میدان میں پہلے سے موجود دیکھ رہی تھیں شاید اس لیے میری رائے جاننا چاہتی تھیں۔ ہم ادب شناس لوگ بھی عجیب بے ادب ہیں اکثر تو کتاب پڑھتے تک نہیں رائے دینے کا تکلف تو بہت دور کی بات ہے۔ دوسرا فوری فتویٰ یہ دیا جاتا ہے کہ اتنی دیر سے کتاب آئی؟ حالانکہ دیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کہانیاں پکی ہوئی ہیں وقت کی آنچ اور جذبات کا دم خوب اچھی طرح لگا ہوا ہے۔ یہ کتاب ماورا پبلشرز سے شائع ہوئی ہے دیدہ زیب سرورق زرقا کی نفیس طبیعت کا شاہد ہے۔ زندگی کی زہر آلود نیلاہٹوں سے نڈھال یہ کہانیاں یہیں کہیں بکھری ہوئی ہیں ہمارے اطراف زرقا کی زیرک نگاہی نے انہیں چن لیا اور ادیبہ نے خوب سنبھال کر افسانے کے انگ میں ڈھالا ہے۔ آغاز عمدہ درمیان رمزوں سے بھرا ہوا تجسس محبت اور مروت میں گھلی کہانیاں اور ان کے کاری وار سے بوجھل کردار پرتاثیر ہیں۔ اختتام پنچ لائن کی طرح چونکا دینے والا ہے۔ نیلم احمد بشیر ان کہانیوں کے متعلق کہتی ہیں

''ان کی ہر کہانی واقعات کے بجائے کرداروں کے اردگرد گھومتی ہے۔ کردار لکن میٹی کھیلتے کھیلتے قریب آتے ہیں اور پھر معدوم ہو جاتے ہیں۔ یہ اردگرد ڈولتے مہکتے ہمکتے کردار ہی ہیں جن کی ہست و بود سے

ثمینہ سیّد

زرقا کہانیوں کا چرخہ کاتتی ہیں۔"

یہ بیس کہانیاں جو نام سے ہی پختہ کاری کا پتا دیتی ہیں۔ سادہ اسلوب میں اختصار کو بھی اپنایا لیکن ہر کہانی میں کوئی اہم پیغام ہے کوئی بڑی بات۔ جاگیردارانہ نظام، رویوں کے زخم، طبقاتی فرق سے ہارتی ہوئی دم توڑتی رخ بدلتی محبتیں اور منافقت سے لتھڑے نفرت زدہ کردار جو بنیادوں میں دیمک لگاتے ہیں تو عمارت زمیں بوس ہو جاتی ہے۔

افسانہ رڑک سے اقتباس دیکھیے:

"بھولنا تو پڑتا ہے بادی تبھی تو آدمی آگے بڑھتا ہے۔"

"کیچ مکران کا سانول ہوتا تو کاہے کو تیری آنکھ روتی۔ اچھا سانول سن میں تجھے منع نہیں کرتی تو بیاہ کر لے مہرو سے پر مجھے بھی اپنے ہیروں میں جگہ دے دے گھر میں کامے کی ضرورت بھی تو ہوتی ہے۔"

زرقا کی عورت موم کی بنی عورت ہے لیکن وہ مرد کو چیخ چیخ کر بیوفا نہیں کہتی اس کی طرف داری کر کے اسے بگاڑتی ہے۔ اس کی طرف کی مجبوری بھی خود ہی فرض کر لیتی ہے۔

زرقا کی کہانیوں میں پنجابی شاعری کی آمیزش اسے الگ ہی رنگ دیتی ہے جاذب نظری اور انکشاف کا رنگ۔ بہنے نہ دے--- بولیاں نہ مار جیسے جملے ماحول میں اپنائیت کی چاشنی گھول رہے ہیں۔

دریا اور بریتے میں ویساکھی کا میلہ، بوکر باری، پیکے گھر اور کردار جس رہتل کے ہیں اسی کی زبان بول رہے ہیں جیسے

"آہو سارے پتے بس تجھے ہی ہیں۔ تو جم پڑی ہے عنایت ماچھی کے خاندان میں لامہ اقبال ادھر آ سمجھا مجھے۔"

ان جملوں کا اصل کیا ہے ہم خود ہی شناسائی کی منزل تک رسائی پا لیتے ہیں کیونکہ کہانی کی بنت نہایت باریک بینی سے کی گئی ہے۔ بیٹیوں سے قربانی کی توقع کرتے ماں باپ اور طعنے تیار رکھ کے بیٹھا معاشرہ--- زرقا کے موضوعات رہتل کے موضوعات ہیں مشاہدے کی پکی پیٹھی کہانیاں ہیں۔

"میں چاہتی ہوں میرا دل چاہتا ہے تایا۔ میں ہنسوں تو میرا دل آنکھیں روح--- سب ہنسیں اکٹھی جیوں ساری"

"پیٹ تو بالن مانگتا ہے ناں۔"

"اسیں گھر پردیسی ہوئے" محبت کی نسل در نسل باغی کہانی ہے۔ کبیر سنگھ کی بیٹی اسے اسی کی محبت کا حوالہ دے کے اپنے لیے گنجائش نکالتی ہے۔ پھر محبوب بدل جاتا ہے رو رو ہانسی یوئی پھرتی چندی کے چند جملے دیکھیں:

"عورت ایسی ہی ہوتی ہے یا اپنی اپنی پیاس کا فرق ہے۔"

"آوارگی کا جواب کیا آوارگی ہے--- بدن کی نہ سہی ذہن کی سہی"

"گلاب بونے کے لیے انہیں پانی دینے

کے لیے ایک جگ پہ رہنا پڑتا ہے۔ تو نے مجھ اور میں نے تمہیں مسافر بنا دیا۔ اب ان گلابوں کی کیا ضرورت اس لیے کاٹ دیے انہیں کون دیکھے گا۔"

"بانکڑی" افسانہ

"تم مان کیوں نہیں لیتی کہ عورت کے تحفظ اور خوشی کے لیے مرد کا ساتھ ضروری ہے۔"

"مرد اور عورت کے رشتے کو جتنا نقصان اس بحث نے پہنچایا ہے کسی دوسری چیز نے نہیں پہنچایا۔"

صبح کا ذب افسانے کی

"شہزادی باشعور ہے وہ منکوحہ اور کنیز کا فرق سمجھتی ہے۔ شاہی محل کی مکین بن کر بھی اس نے اپنا تحقیق اور مطالعہ کا شوق جاری رکھا۔"

سچائی کا کرب افسانے میں ایک گہری رمز دیکھیے

"یہ تو اسے بہت بعد میں بڑی ہونے پر پتہ چلا کہ جن ماؤں کی خوشیاں چھین لی جاتی ہیں ان کی مائیں تو اصلی یوتی ہیں مگر ان کی ہنسی جھوٹی ہوتی ہے۔"

زرقا نے منظر کشی بھی کمال کی ہے روایات کی جھلک واضح ہے۔ فطرت کا حسن ذوق جمالیات کا پتہ دیتا ہے۔

صفحہ نمبر 85 پر لکھتی ہیں

"ہسپتال کی دیوار کے ساتھ لگے درختوں پر سنتھے کی باڑوں پر کہرے کی چادر پھیلی تھی ۔ گھاس کے تنکوں پر زرد رنگ غالب تھا۔"

"کچھ زخم کسی دوا سے نہیں بھرتے۔ ان کے لیے صرف ایک ہی مرہم ہوتا ہے--- توبہ کا مرہم--- استغفار کا لیپ"

گھر سے کیمپ تک اور نازک ہے بہت کام" بہت نازک سوشل ایشوز پر کھل کے لکھے ہوئے افسانے ہیں۔ قلی یار دی" عجیب ہی کہانی ہے عورت کو اپنا مرد چاہیے مکمل توجہ دینے والا مرد۔ بھلے ترقی خوشحالی ہو نہ ہو بس گھر کا نظام جڑا رہے۔

ڈھاکہ کی جدائی بکھیرتی کہانی بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔ محبت مرہم ہے --- سامنے نہ سامنے--- برف میں دھوپ اور کفارہ دل موہ لینے والی کہانیاں ہیں لیکن آپ کتاب پڑھ کر ان کہانیوں سے ملیں۔ ایک عرصے بعد اچھی کہانیاں پڑھنے کو ملی ہیں جن میں کہانی اپنی اصل شکل میں ہے۔

مفکرین وفلاسفروں کے اقوال بھی کہانی کی گرفت کے لیے شامل ہیں جو زرقا کے تجربے مشاہدے اور مطالعے کا ثبوت ہیں۔

چانکیہ کے اشلوک کے ساتھ میں اپنا مضمون سمیٹتی ہوں اس بہترین کتاب کے لیے زرقا فاطمہ کو بہت مبارک باد اگلی کتاب کا انتظار شروع ہے لکھتی رہیں۔

"برے انسان اور سانپوں کا اگر موازنہ کیا جائے تو سانپ بہتر ہے کیونکہ سانپ اسی وقت ڈستا جب موت آتی ہے اور انسان تو قدم قدم پہ ڈستا ہے۔"

☆☆☆☆☆

خدا غریبی کے لباس میں پھرتا ہے

یہ تحریر حراست غربت میں جکڑی زندگی کو جینے والوں کی روح پر پڑے حالات کے ٹیلے نشانوں کی ہلکی سی جھلک ہے۔ اسے نیکوکار امیروں کے خلاف فتوی نہ سمجھ لیجئے گا یہ مال و دولت کی پوجا کرنے والے اُن اندرونی جسموں کے منظروں کی نشاندہی ہے جن کے بیرونی حلیے مذہبی و غیر مذہبی اچھائیوں کے فریبی لباس پہنے پھرتے ہیں جن کی پہچان تب ہوتی ہے جب ان سے واسطہ پڑتا ہے بنا معاملات کیے میں کسی کی گواہی دینے پر یقین نہیں رکھتا۔

یہ حق میں صرف خود سے پہلے گزر جانے والے اچھوں اور بچوں کو دیتا ہوں جن کی شہادت جیتے ہوئے مقدمہ انسانیت کی کتابوں میں ملتی ہے۔ میں نے اپنی مجبوریوں کا گلہ کاٹتی غربت کی تلوار کو پگھلا کر فاقے کا قلم بنالیا جس میں بھری تو بھوک کی سیاہی ہے مگر لکھے جانے والے تمام سچ صحت مند ہی ملیں گے دعا ہے پڑھنے والوں کے دماغوں کے معدے کا ہاضمہ درست ہو۔

جس انسان کی زندگی اپنوں اور بیگانوں کی وجہ سے لاتعداد محرومیوں سے بھری پڑی ہو دل موم کا اور زمانہ پتھر کا ملا ہو اوپر سے صاحب اولاد بھی ہو اور رہتا ایسے معاشرے میں ہو جہاں حلال کا فقدان کثرت سے پایا جاتا ہو وہاں ایک جاگتے ایمان و ضمیر کا غریب انسان روز صبح کو یوں اُٹھتا ہو جیسے آواز صور سن کر بے چارے مردے اپنی بے حساب دردمند زندگی کا حساب دینے کے واسطے اپنی اپنی قبروں سے اُٹھتے ہیں۔

غربت کی زندگی کو جینے کا شوق جنون کی حد تک نہیں پہنچتا کتنے ہی ایسے انسان ہیں جنھیں اگر اپنے رشتوں کے لیے زندہ رہنے کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ اپنے درد بھرے مقدر کا چہرہ دیکھتے ہی اسے قدرت کو واپس دے کر عالم ارواح میں لوٹ جاتے کیونکہ دنیا کی زندگی زمینی خداؤں کے زیر سایہ گزارنا آسمانی خدا کے ماننے والوں کے لیے احساس جہنم ہے۔

دنیا اور غربت دو الگ امتحان ہیں۔ خدا کا تخت غریبوں کا دل ہے اور ایسے کئی واقعات

ظفر اقبال ظفر

ہیں جن میں خدا غریبوں کے جسم کا لباس اُوڑھ کر صاحب مال لوگوں کو آزمانے ان کے پاس جاتا ہے اور خدا تک پہنچنے والوں نے بھی غریبوں کی مدد سے کم وقت میں جلد پہنچنے کا نتیجہ پایا ہے اس کی وضاحت میں یہ واقعہ پڑھ لیجیے۔

ایک بندے نے خدا سے سوال کیا کہ اے خدا تیرے وہ بندے کہاں ہوتے ہیں جن کی تو کوئی بات نہیں ٹالتا؟ خدا نے اسے بازار میں ایک برتن فروش کی دکان پر بیٹھے انسان کی نشاندہی کی۔ یہ بندہ خدا کے تعلق میں رہنے والے بندے کو اس غرض سے دیکھنے گیا کہ وہ کون سا عمل ہے جو خدائی رابطے کا وسیلہ بنتا ہے اس بندے نے دیکھا کہ بازار میں ایک عورت اپنی دیگچی فروخت کرنے کے لیے دکانوں پر جاتی ہے اور اس کی قیمت سن کر پلٹ آتی کوئی دو دینار لگاتا تو کوئی تین دینار لگاتا زیادہ سے زیادہ پانچ دینار لگے یہ بندہ اس عورت کے پیچھے پیچھے سارا معاملہ دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ وہ عورت اُس برتن فروش انسان کے پاس پہنچی جس کے پاس خدا نے اس سوالی کو بھیجا تھا وہ دیکھتا ہے کہ یہ برتن فروش اس عورت کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اس کے ہاتھوں سے دیگچی پکڑتے ہوئے کہنے لگا یہ تو قیمتی ہے میں اسے خریدنا چاہوں گا اور تیس دینار اس عورت کے ہاتھوں پر رکھے تو اس عورت کے غمزادہ چہرے پر خوشی کی بہار نمودار ہونے لگی وہ رقم ہاتھوں میں لیتے ہی اسے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوگئی اس عورت کا تعاقب کرنے والا یہ شخص جو سارا معاملہ دیکھتا آ رہا تھا اس نے اس بندے سے کہا کہ سارے بازار میں اس دیگچی کی پانچ دینار سے زیادہ قیمت کسی نے نہیں لگائی اور تم نے اسے تیس دینار میں خرید لیا؟

اس پر اس بندے نے کہا کہ یہ دیگچی کے پیسے نہیں ہیں یہ اس کی دوائی اور راشن کے پیسے ہیں یہ میرے پیسے نہیں ہیں یہ خدا کے پیسے ہیں میں تو خدا کے مجبور بندوں میں تقسیم کرنے کی ڈیوٹی دے رہا ہوں۔ یہ جو دیکھنے آیا تھا کہ وہ کون سے بندے ہیں جن کی خدا کوئی بات نہیں ٹالتا سارا معاملہ دیکھ کر اپنے جواب کے ساتھ لوٹ آیا۔

خدا مجبوروں ضرورت مندوں کے روپ میں صاحب حیثیت لوگوں کے پاس آزمائش بن کر جاتا ہے کہ اُس وقت جو مدد کرتے ہیں وہ انسانوں کی نہیں خدا کی مدد کرتے ہیں اور خدا قرض نہیں رکھتا اور جو خدا سے نظریں پھیر کر مال کو عزیز رکھتے ہیں خدا انہیں ملنا تو دور کی بات اپنی ذات کی خوشبو بھی نہیں سونگھنے دیتا۔

کتنے ہی ایسے والدین چار سو نظر آتے ہیں جو بے سروسامانی کے حالات میں اپنے خون جگر سے اولاد کے پودوں کو سینچ کر پروان چڑھاتے ہیں جنھیں دیکھ کر دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہے اور آنکھیں آنسوؤں

میں ڈبڈباتی ہیں۔ میرے نزدیک حقوق العباد کا سب سے بڑا مجرم وہ مذہبی بندہ ہے جو کثرت مال رکھنے کے باوجود کسی کی دنیا آسان کرنے کے بجائے اس کی آخرت آسان کرنے کا فریب خادم دین بن کر دیتا ہے جو خادم انسان نہیں وہ خادم دین و خدا نہیں ہو سکتا۔

جہاں مجھے دنیا کی دوزخ میں پھنسے غم و لاچاری کے ماروں کا درد اپنے سینے میں محسوس ہوتا ہے وہاں ایسے لوگوں کی آخرت کی چیخیں بھی اپنے کانوں میں سنائی دیتی ہیں جو انسانیت سے منہ موڑ کے دل دولت کی جانب رکھتے ہوئے اپنے ضمیر میں مار بیٹھتے ہیں۔ ایسے مالدار قابل رحم تو ہیں کہ جن کے پاس مال کے علاوہ کوئی نیک اعمال نہیں ہوں گے یہ روز قیامت بدنصیب بن کر لرزاں و ترساں کھڑے ہونگے تب خدا ان سے وہ سلوک کرے گا جو یہ دنیا میں خدا کے بندوں سے کیا کرتے تھے ان کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپکیں دل پہ بجلیاں گریں یا آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹیں غریبوں کا خدا ترس نہیں کھائے گا۔

کتنے ہی ایسے مالدار لوگ ہیں جو دوسروں کی مدد کے جذبہ ایمانی سے محروم تو ہوتے ہی ہیں مگر خود بھی اپنی ذہنی غربت کی وجہ سے فاقے کاٹ رہے ہوتے ہیں میں نے ایسے مذہبی مالدار بھی دیکھے ہیں جو بڑی بڑی دینی علمی گفتگو کے ساتھ عبادت گزار نظر آتے ہیں مگر جب کوئی ضرورت مند ان کے سامنے دست سوال کرتا ہے تو یہ دو کوڑی کے نکلتے ہیں لوگوں کی مجبوری خریدنے میں فائدہ مال کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا سودا کرتے ہیں کہ منافع جیت جاتے ہیں اور انسانیت ہار جاتی ہے۔

نحوست کثرت زر کی بیماری میں یہ لاعلاج لوگ خدا سے محبت کی بات کریں تو اس کے معنی ہیں مقدس محبت کی تخفیف و توہین کرنے والے۔ جس طرح نیکوکار لوگوں کے دلوں کا نور ان کے چہروں پر عیاں ہوتا ہے اسی طرح طالب دنیا کے دل میں حوس کا تواتر چہرے پر لالچ کا پیدا کردہ عکس دیکھاتا ہے۔

یہ ایک مجبوری بتا سکتا ہے کہ ایک مصیبت سے دوسری مصیبت تک کا درمیانی فاصلہ سکون حیات کہلاتا ہے وہ دو بندے آپس میں اچھے ہمدرد بن جاتے ہیں جن پر زندگی کی تلخیاں ایک جیسی گزر رہی ہوتی ہیں۔

ایک بندہ سردی کی راتوں میں اپنے نرم و گرم بستر میں لیٹا خدا سے کہہ رہا تھا کہ اے خدا میں تجھ سے ملنا چاہتا ہوں۔ تو خدا نے جواب دیا کہ یاد کر شدید سردی کی اُس رات جب تو اپنے نرم و گرم بستر میں لیٹا تھا اور تیرے دروازے پر ایک پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس سردی سے ٹھٹھراتا ہوا غریب شخص سوال کرنے آیا تھا اور تو اُٹھ کر جا نہ سکا۔۔۔ وہ تو میں تھا۔

☆☆☆☆☆

کہانی چل رہی ہے..... شہزاد نیّر

احساسات کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔ کبھی انسان اس کے اثرات کے تحت خلاؤں میں اڑتا رہتا ہے اور لحہ لحہ کئی طرح کی کیفیات سے گزرتا رہتا ہے۔ کبھی وہ آس پاس کے حالات سے گزرتے ہوئے طرح طرح کی خوشیوں یا پھر اذیتوں کی زد میں ہوتا ہے، کبھی وہ پوری دنیا کو مخالف سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے تو کبھی لگتا ہے سب ہی اس کے خیر خواہ ہیں۔ جنگ محض اس کی اپنی ذات سے ہے۔۔ خیر سے اگر فنکار کی حسی کیفیت بہت تیز ہے اور شدید ہے تو اس کے لیے خیر و شر کی یہ دنیا کچھ زیادہ ہی اسے الجھا دیتی ہے، بلکہ تمام معاملات میں اسے مشکوک بنا دیتی ہے اور وہ شک و شبہ میں اسیر طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ زندگی کی مکانی اور لامکانی طرفیں اسے مسلسل ضرب لگاتی رہتی ہیں۔ یہ ضرب اس کی تخلیقی جہت بن جاتی ہے اور وہ ساری دنیا سے الگ تھلگ اپنی آگ میں جھلستا رہتا ہے۔ کبھی یہ جلن اس کی تحریر کا خاصا بن جاتی ہے اور کبھی اتنی مبہم رہتی ہے کہ اس کا قاری الجھتے ہوئے اس کے لیے مثبت اور منفی تفہیم کے درمیان کوئی جگہ اسے دے دینا چاہتے ہیں۔

شہزاد نیّر کا نام اردو ادب کے لیے نیا ہرگز نہیں ہے وہ شعر و سخن میں لوہا منوا چکے ہیں یعنی نظم و غزل میں کئی کتب دے چکے ہیں اور کئی ادبی ایوارڈ اپنے نام کر چکے ہیں۔ ہاں البتہ ''کہانی چل رہی ہے'' ان کی پہلی کتاب ہے جو مائیکرو فکشن (افسانچوں) پر مشتمل ہے اور تبرک کے طور پر دو تین افسانے بھی شامل ہیں۔۔۔

انھوں نے زندگی کے اپنے تجربات و

شاہ روم خان ولی

مشاہدات کو کہانیوں کا روپ دینے کی اچھی کوشش کی ہے۔ شہزاد نیّر صاحب کی جوانی تقریباً فوج میں گزری قریہ قریہ نگر نگر گھومے، فضاؤں کے تقاضوں نے انھیں دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کا ایک نیا انداز دیا ہے جو ان کی کہانیوں میں بار بار ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جہاں ان کے نسوانی کردار، محبت خلوص، ایثار کا لافانی جذبہ رکھتے ہیں، وہیں ذہنی، اقتصادی اور سماجی آزادی کے لیے کوشاں بھی ہیں۔ ان کے نسوانی کردار متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ روایات اور سماجی پابندیوں کی پاسداری بھی لازمی ہوتی ہے۔ متوسط طبقہ کی زندگی اپنی کچھ مجبوریوں کی بنا پر دھیمی چال سے چلنے والی ندی کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں اتار چڑھاؤ اور طوفان کم ہی ہوتے ہیں۔۔

شہزاد نیّر صاحب کی یہ کہانیاں بھی دھیمی چال سے چلتی ہیں۔۔ ایک طے شدہ منزل کی طرف۔ یہ نہ شور مچاتی ہیں نہ تڑک بھڑک سے کام لیتی ہے۔ اسی لیے یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں زندگی کے نزدیک رہتی ہیں۔ ان مسائل پر گفتگو کرتی ہیں جو ہمیں روز ہی پیش آتے ہیں لیکن ہم انہیں معمولی اور غیر اہم جان کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

شہزاد نیر صاحب کی کہانیوں (مائیکرو فکشن) کا پہلا مجموعہ "کہانی چل رہی ہے" کے نام سے منصۂ شہود پر آیا۔ اس کتاب کی ہر کہانی کسی نہ کسی طرح کہانی بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ کہیں یہ عکس دھندلا ہے، کہیں ٹیڑھا میڑھا اور کہیں سے ٹوٹا پھوٹا۔۔ اس میں کہانی کار کا کیا قصور ہے وہ تو ہمیشہ سچ بولتا ہے جب زندگی ہی ایسی ہے تو اس کا عکس بھی ایسا ہی ہوگا۔ کہنے کا مطلب ہے کہ یہ کہانیاں سچ بولتی ہیں اور چل رہی ہیں۔۔ ان کا یہ سچ قاری کو سوچنے پر ضرور مجبور کرتا ہے۔ تمام کہانیاں کسی نہ کسی طرح معاشرے کے گرد چل رہی ہیں۔۔ شاید اس لیے کہ مصنف خود بھی ان کہانیوں کے ساتھ چل رہے ہیں یا چلتے رہے ہیں۔۔

ان کرداروں کو تخلیق کرنے والے چاہتے ہیں کہ ان کی کہانیاں چلیں بھی اور ان کو آزادی بھی ملے تاکہ وہ آزادی سے چل سکیں اور ان کا احترام بھی کیا جائے لیکن یہ راستے سے بھٹکے نہیں۔ یہ وہ سماجی اقدار ہیں جن کی طرف ہر کہانی اشارہ کرتی ہے۔۔

شہزاد نیّر صاحب کی کہانیاں (مائیکرو فکشن) بیانیہ تکنیک میں لکھی گئی ہیں۔۔ انسانیت کی فلاح و بہبود، نیک مقصد، ظلم کے خلاف احتجاج، محبت اور اخوت، سماجی بے انصافی اور ظلم کے خلاف ایک قدم ہے۔ شہزاد صاحب کے کردار باغی نہیں ہیں لیکن مصنف بار بار اس امر کا احساس دلاتے محسوس ہوتے ہیں کہ آپ کا ایک غلط قدم اُسے تباہی کے اندھے غار میں جھونک دے

گا۔ یہ کہانیاں (مائیکرو فکشن) ایک صالح اور ایماندارانہ پیغام دیتی ہیں۔
ان کی کہانیوں میں کم وبیش سبھی کی آنکھیں کسی نہ کسی وقت نم ہوتی ہیں لیکن مصنف کی شراب زندگی خشک ہو چکی ہے۔ اس کے پاس صرف گزرے ہوئے اور موجودہ زمانے کی ریت ہے جس سے وہ اپنے جام کو بھر لیتا ہے۔ ریت کا کرکرا ذائقہ اسے زندگی سے قریب تر لے جاتا ہے لیکن پاکیزہ حیات کی تلاش وہ پھر بھی کرتا رہتا ہے۔
کتاب کے نام کے علاوہ کئی ایسی کہانیاں ہیں جسے پڑھ لیجیے۔ آپ کو احساس ہوگا کہ فنکار کی عظمت اس میں نہیں ہے وہ رلاتا ہے بلکہ اس کی بڑائی اس دنیا کی تعمیر ہے جو اس کے ذہن میں ہے جس سے یہ دنیا متضاد چل رہی ہے۔ سو انھیں معلوم ہے کہ ان کی کراہ انھیں پگھلا رہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہو۔۔۔
چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔
(1) ''اپنی بیوی کے بین سن کر بھی اس کا کوئی آنسو نہیں نکلا۔ اُس نے برادری والوں سے کہہ دیا کہ ریاست کا کوئی بھی ملکی یا غیر ملکی دشمن میری خدمات لے سکتا ہے۔ چاہیے کوئی میرے جسم کے ساتھ بم باندھ دے۔ مقتول کی ماں روتے ہوئے آگے بڑھی ''مجھے بھی بم باندھو مجھے بھی بم باندھو۔۔۔''
(ریاست اور بم)
(2) '' ماں نے چوک کر دیکھا ۔ منہ پر بے تحاشا میک اپ تھوپے، ہیجڑوں کے سے لوچ دار لہجے میں بھیک مانگنے والا اس کا اپنا عصمت تھا۔ اُسے زور کے چکر آنے لگے۔ بہن اور بھائی کے سنبھالتے سنبھالتے ماں زمین پر گر گئی۔۔
(سینۂ شب)
(3) صاحب! رونے کے ہزار موضوع ہیں۔ بیمار باپ اور لاچار ماں کے علاوہ بھی رونے کی کئی باتیں ہیں۔ جوان بہنوں اور اپنی شادی کا موضوع بھی رونے رلانے کو کافی ہے۔ اور تو اور خوشی سے معمور، امیر، شاداب چہروں اور نوجوان جسموں کو دیکھ کر بھی مجھے رونا آجاتا ہے۔
(ہنستے ہوئے رونا)
دراصل یہ اقتباسات ان مباحث کی دلیل ہیں جو میں آگے لکھ چکا ہوں۔ شہزاد صاحب کی کہانیوں کی انفرادی کیفیت ان کے بیان میں تو ہے ہی سرشت اور قدروں کا تصادم جس طرح ان کی کہانیوں میں پیش ہوتا آیا ہے۔ اس کی دوسری کوئی مثال کم از کم مجھے اور کہیں نہیں ملتی۔
شہزاد منیر صاحب کی کہانی ابھی چل رہی ہے۔۔ ان کے فنِ افسانہ اور مشاہدہ کو اور نکھرنا، سنورنا ہے۔۔ میں انھیں ''کہانی چل رہی ہے'' افسانچوں (مائیکرو فکشن) کی پہلی کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔۔۔

☆☆☆☆☆

ریاض ندیم نیازی کی نعت کا فکری مطالعہ

ریاض ندیم نیازی بلوچستان کے علاقے سبی میں پیدا ہوئے۔ بلوچستان یونی ورسٹی کوئٹہ سے ایم اے صحافت کیا۔ سرکاری ملازم ہیں اور سبی میں ہی رہائش پذیر ہیں۔ علم و ادب کی خدمت گزاری میں اپنے قلم کو وقف کیے ہوئے ہیں۔ حمد و نعت میں ایک خاص پہچان رکھتے ہیں۔ میں نے اپنے اِس مضمون میں اُن کی چار نعتیہ کتابوں [خوش بو تری جوئے کرم]، [ہوئے جو حاضر در نبی پر]، [جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں] اور [چمن زارِ حمد و نعت] کے حوالے سے اُن کی نعت کا فکری مطالعہ کیا ہے۔

موصوف نے ہر موضوع کے ساتھ مکمل انصاف کیا ہے۔ اِن کی نعت کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ نعت لکھتے ہوئے خود کو ایک خاص ماحول میں رکھتے ہیں۔ اِن کے دل و نظر کی دنیا نورانی جلووں سے آباد ہوتی ہے۔ یعنی وہ خود کو نعت کے لیے تیار کرتے ہیں۔ انھیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ جو لکھ رہے ہیں وہ امر ہوگا اور یہی سچائی ہے۔ اس لیے وہ بڑے متوازن اور یقین بھرے لہجے میں نعت کہتے ہیں۔

میں اپنے مضمون کو اُن کی نعت تک لے جانے سے پہلے اُن کی حمد کے دو اشعار کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اشعار نہیں ہیں بلکہ اُن کا عقیدہ، ایمان اور نظریہ ہے اور یہی سوچ، جذبہ اور خیال نعت میں بھی موج زن ہے۔ وہ نعت کہتے ہوئے بھی شعر نہیں کہہ رہے ہوتے بلکہ اپنے دل کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔

اُن کی حمد دیکھیں:

آشنائی ہو جو اُس کے نور سے
بند آنکھوں سے بھی دیکھا جائے گا
(چمن زارِ حمد و نعت، ص:66)

حمدِ باری میں ہے پوشیدہ بشر کا ارتقا
ہے اِسی میں جاں کا، دل کا اور نظر کا ارتقا
(چمن زارِ حمد و نعت، ص:254)

احسان اللہ طاہر

حمد و نعت ہی وہ مقالہ ہے، حمد و نعت ہی وہ عبادت ہے جس میں ہم دوسروں کو شامل کر کے اپنے ماحول کو خوش گوار بنا سکتے ہیں، اپنے گھر کے در و دیوار کو مہکا سکتے ہیں اور موصوف کی حمد و نعت میں یہ ساری کوششیں اِسی حوالے سے ہیں۔

ریاض ندیم نیازی کی نعت کے مضامین دل و نظر پہ اثر کرتے ہیں۔ وہ بڑی سادہ اور عام فہم بات کرتے ہیں۔ اُنھوں نے سیرتِ رسولؐ کے موضوع کو اپنی نعت کی بنیاد میں رکھا ہے۔ وہ ذکرِ سیرتِ سرکار سے ہی کئی ضمنی مضامین نکال لاتے ہیں۔ اِس حوالے سے ان کے اشعار اپنی سادگی کی وجہ سے منفرد دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ نبیِ کریم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کرداری حوالے سے پیش کرتے ہیں۔

موصوف نے سیرتِ رسولؐ پر عمل پیرا ہو کر زندگی گزارنے کو انسانی سوچ اور فکر و عمل کا اِرتقا کہا ہے۔ وہ اِسی میں انسانی کردار اور اقدار کے ارتقا کی بات کرتے ہیں۔ اِن کی نعت اِسی حوالے سے معنی و مفہوم کے کئی نئے پہلوؤں اور زاویوں کو بیان کرتی ہے۔ اگر بنیادی حوالے سے دیکھا جائے تو جو شعرا سیرتِ رسولؐ کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اُن کی نعت ہی یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ نعت کو ذکرِ سیرتِ رسولؐ ہی سمجھتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نعت فقط سراپا بیان کرنے کا نام نہیں بلکہ اُسوۂ رسولؐ کو سلیقے سے بیان کرنے کا نام ہے۔ ریاض ندیم نیازی کا تعلق بھی ایسے شعرا سے ہے۔ جنھوں نے پہلے سیرت کا مطالعہ کیا، پھر اُسے سمجھا اور اُس پر عمل پیرا ہو کر اِس عمل کو نعت کہا۔ یوں اِن کی نعت ایک اُسی بنیادی نقطے کو لے کر اپنے موضوعات میں تنوع پیدا کرتی ہوئی نعت بنتی ہے۔ اگر ہم یوں کہیں کہ اِن کی نعت کے لفظوں میں جو اُجالا ہے وہ سب ذکرِ سیرتِ سرکار کے سبب ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ اِن کی گفتگو میں جو خوش بو ہے اُس کی بنیادی وجہ اِن کی سیرت سے عقیدت ہے:

جو عقیدت سیرتِ آقا سے رکھتے ہیں ندیم
جانتے ہیں کیسے کرتی ہے اُجالا گفتگو
(چمن زارِ حمد و نعت، ص: 271)

ہے یہ علم و فضل و فکر و آگہی کا راستہ
طاعتِ خیر البشر ہے روشنی کا راستہ
(ہوئے جو حاضر درِ نبی پر، ص: 57)

ریاض ندیم نیازی کی نعت کا دوسرا بڑا موضوع درود و سلام ہے۔ عہدِ حاضر کے نعت گو شعرا نے اب درود و سلام کو باقاعدہ صنفِ سخن کے طور پر لکھنا شروع کر دیا ہے اور اب تو ہر نعتیہ کتاب میں اِسے باقاعدہ لکھا جا رہا ہے۔ جو لوگ اِسے الگ سے نہیں لکھ رہے اُن کی تقریباً ہر نعت میں کوئی نہ کوئی ایسا شعر ضرور نکل

آتا ہے جس میں درود وسلام کے ثمرات وانعامات اور وردِ درود وسلام کی برکتوں کا ذکر ہو۔ اسے روحانی اور قلبی واردات کے حوالے سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ اصل میں وہ لوگ جو سیرتِ رسولؐ کریم پہ گام زن ہو کر نعت لکھتے ہیں، اُن کو تخلیقِ نعت کی صورت میں جو جزا دکھائی دیتی ہے وہ اسی روحانی کیف میں اپنی اِس جزا کا ذکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی تخلیق کار اُسوۂ رسولؐ کا گہرا مطالعہ بھی رکھتا ہو اور حکمِ [اطیعوا اللہ و اطیعوالرسول] کو بھی مدنظر رکھ کر زندگی بسر کرنے کا جذبہ رکھتا ہو اور اِس کی نعت میں درود وسلام کا حوالہ نہ ملے۔

ریاض ندیم نیازی کی نعت میں درود و سلام کا حوالہ اُن کی نعت کو ایک نیا رنگ بخشتا ہے کیوں کہ اِس موضوع میں وہ روایتی پن سے کام نہیں لیتے۔ وہ اِس سچائی اور عمل کو مدنظر رکھ کر نعت کہتے ہیں جو کہ اُن کے دل میں ہے۔ اِس حوالے سے جیسے اُن کی نعت کے لفظ روشن ہیں ویسے ہی اُن کا اپنے نبی کریم سے رابطہ بھی روشن دکھائی دیتا ہے کہ وہ اِسی ذکر کو زندگی اور زندگی میں اِسی خیال کو بھولنے یا دل سے جانے کو موت کہتے ہیں۔ درود و سلام کے حوالے سے موصوف کے نعتیہ اشعار جہاں اُن کی اپنی دلی کیفیت کو بیان کرتے ہیں وہاں وہ ہمیں بھی اِس وجد آور کیف کی دنیا میں بسنے کی دعوت دیتے ہیں جہاں درود وسلام لبوں پہ سجائے لوگ جب بات کرتے ہیں تو اُن کی گفتگو میں اُجالے اترتے ہیں۔ اُن کے لفظ روشنی بن کر دلوں کو منور کرتے ہیں۔ روح کو تازگی بخشتے ہیں۔ انھوں نے بڑے لمبے چوڑے انداز اور خطیبانہ حوالے سے اپنی باتیں نہیں کیں بلکہ وہ جس اختصار سے بات کرتے ہیں موضوع اُسی حوالے سے مفصل ہوتا دکھائی دینے لگتا ہے۔ درود وسلام کے حوالے سے اُن کے کہے ہوئے اشعار میں شعریت اور تخلیق کا رنگ بھی نمایاں ہے۔

لب پر ہے درود اُس کے ندیمؔ آنکھیں ہیں روشن
سر میں کوئی اَن مول سا سودا ہے یقیناً
(چمن زار حمد و نعت، ص:43)

دل ہی دل میں مستقل ہم پڑھتے رہتے ہیں درود
رابطہ رہتا ہے اپنا مصطفیٰ سے رات دن
(چمن زار حمد و نعت، ص:63)

پڑھیے درود مستقل، رکھیے خیال ہر گھڑی
اُن کا خیال زندگی، اُن کا خیال جائے کیوں
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:114)

جو بارگاہ نبی میں آئے درود لے کر سلام لے کر
کریم نے پھر انھیں نوازا، کرم کے جلوے دکھا دکھا کر
(ہوئے جو حاضر در نبی پر، ص:49)

ریاض ندیم نیازی نے اپنے فکر وفن سے نعتوں کے جو دیے جلائے ہیں اِن کی روشنی اِن کے اندر اور باہر کو روشن کیے ہوئے ہے۔ اِن کا یقین ہے کہ سیرتِ رسولؐ سے عقیدت اور اطاعتِ خیر البشر وہ چراغ ہے جس سے دل ونظر تو منور ہوتے ہی ہیں، زندگی میں اُجالے تو آتے ہی ہیں مگر اِن دیوں کی روشنی بعد مرنے کے لحد کو بھی روشن رکھتی ہے۔

ریاض ندیم نیازی کی نعت کا یہ پہلو بنیادی طور پر اُن کے اندر کا یقین ہے جو کہ لفظوں کا نور لے کر قاری کے دل و نظر کو منور کرتا ہے۔

اِن کی نعت میں یہ موضوع اُن کی ہر کتاب میں پھیلا ہُوا ہے۔ وہ تکرار سے بچنے کے لیے اِس کا انداز بدل کر اِسے یوں بیان کرتے ہیں کہ ہر بار اِس میں نیا فکری پن دکھائی دینے لگتا ہے۔ کبھی وہ نعت نگاری کو اپنی زندگی کا حوالہ کہہ کر اِسے محشر میں کام یابی و کامرانی کا وسیلہ لکھتے ہیں تو کبھی اِس حوالے کو قبر کا نور کہتے ہیں۔

یہ موضوع اگر ذاتی حوالے سے بھی دیکھا جائے تو اُن کی اِسی پاکیزہ محبت اور اطاعتِ رسولؐ کے جذبے کو دکھاتا ہے جو کہ اِن سے نعت نگاری کروا رہا ہے۔ انھوں نے اِس جذبے کو نام دیے ہیں اور ہر نام سے یقین اور اِن کے دل کی سچائی سنائی بھی دیتی ہے اور دکھائی بھی۔ انھوں نے جس انداز سے اِس احساس کو زبان دی ہے وہ نعت کا پہلو یوں بنتا ہے کہ اِس احساس اور یقین کو پختگی دینے والی بھی نعت ہی ہے اور وہ اطاعت اور عقیدت ہے جو کہ اِن کو اس موضوع تک لے آئی ہے۔

زندگی کی ہر روشنی ختم ہونے والی ہے۔ ہر محبت کی روشنی، ہر پیار کا اجالا، ہر عقیدت کی ضیا مٹنے والی ہے کیوں کہ یہ سب عارضی اور وقتی روشنیاں ہیں۔ یہ سب دنیاوی اُجالے ہیں جن کی قدر و قیمت سانسوں کی آمد و رفت تک ہے۔ یہاں کی نسبتوں کا تعلق یہاں تک ہے مگر دامنِ کرم سے وابستگی اور نبیؐ کریم سے نسبت و تعلق کی روشنی، درود و سلام کے سانسوں میں اُجالے، روح میں اترتی ہوئی عقیدت، آلؑ نبی و صحابہ کرامؓ کی روشنی؛ قبر، برزخ اور محشر میں چھاؤں بن کر اترے گی۔ روشنی بن کر ہمارے نامۂ اعمال کو روشن رکھے گی۔ یہ وہ یقین اور ایمان ہے جو کہ ریاض ندیم نیازی نے اپنی نعت میں یوں بکھیرا ہے کہ قاری پڑھتے ہوئے خود کو اسی روشنی میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

قبر میں بھی رہے روشنی آپ کی
زندگی کا صلہ اور کیا چاہیے

(خوش بو تری جوئے کرم، ص:88)

چراغِ عشقِ محبوبِ خدا سے دل کرو روشن
یہی وہ روشنی ہے جس سے روشن قبر بھی ہوگی
(خوش بو تری جوئے کرم، ص:96)

لو لگا اُن سے گر چاہتا ہے ندیم
اِک دیا قبر میں روشنی کے لیے
(ہوئے جو حاضر درِ نبی پر، ص:151)

نعتِ مصطفیٰ کہنا کسی نعمت سے کم نہیں اور جن کو یہ نعمت ملتی ہے وہ اِس کی خوب پذیرائی بھی کرتے ہیں۔ اگر بستی کے لوگ نعت کے صدقے نعت گو شعرا کی توقیر کرتے ہیں، اُن کی عزت کرتے ہیں اور احترام سے پیش آتے ہیں تو یہ اُن کی دُنیاوی کمائی ہے کیوں کہ نعت نگاری توفیقِ خداوندی ہے اور لوگوں کے دلوں میں احترام کا بیٹھ جانا بھی خدائے وحدہٗ لاشریک کا کرم نہیں تو کیا ہے۔ خدائے یکتا نے اپنے محبوب کے ذکر کو بلند کر دیا ہے اور اِس کے دشمنوں کو ابتر کر دیا ہے۔

عشقِ مصطفیٰ وہ دیا ہے کہ ایک بار جس کے دِل میں جل اُٹھے اُس کی روح کو روحانی خوشی اور دولتِ سکوں سے سرشار کر دیتا ہے اور یہی روحانی خوشی اُسے تخلیقِ نعت پر آمادہ کار اور ہر دم تر و تازہ رکھتی ہے۔ ریاض ندیم نیازی کی نعت میں بھی یہی معاملہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ جو ہر دم تخلیقِ نعت پہ مائل دکھائی دیتے ہیں، دراصل وہ اِن کے اندر کی روحانی خوشی ہے، وہ دولتِ بیدار ہے جس میں وہ ہر پل اضافہ چاہتے ہیں اور اِس میں اضافہ تبھی ممکن ہے جب اِس دولت کو بانٹا جائے اور یہ بانٹنا اُن کے نزدیک نعت کہہ کر اُسے پھیلانا ہی ہے۔ اِس حوالے سے اگر اُن کی نعت کا مطالعہ کیا جائے تو اُن کا سکون اُن کے لفظ لفظ میں اُترتا ہُوا محسوس ہوگا۔ بنیادی طور پہ وہ اِسی سکون کو، عقیدت اور طمانیت کو ذکرِ رسولِ خدا سے حاصل ہونے والی رونقِ دل و جاں کو نعت ہی کے ذریعے پھیلانا چاہتے ہیں اور اس میں وہ کام یاب بھی ہوئے ہیں۔ یوں اُن کی نعت فکری حوالے سے دو قدم آگے بڑھ کر عملی حوالے سے سماج میں اِسی خوش بو کو پھیلاتی نظر آتی ہے۔

مجھے اِس جہاں میں پہلے کوئی پوچھتا نہیں تھا
کہ ملی ہے جتنی عزت مجھے نعت سے ملی ہے
(چمن زار حمد و نعت، ص:77)

مجھے نعت نبیؐ سے کیا ملا ہے کیا بتاؤں میں
تصور کر نہیں سکتا کوئی میری کمائی کا
(چمن زار حمد و نعت، ص:253)

پوچھتے ہو کیا ہم سے، مدحِ شہؐ میں کیا پایا
دولتِ سکوں پائی، عشقِ مصطفیٰ پایا
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:39)

نبی کریم سے عشق و عقیدت رکھنے والے کے کردار کی پہلی اور بنیادی خوب صورتی اس کا اطاعتِ رسولؐ کے رنگ میں

رنگے ہوئے ہونا ہے اور اِسی کو وہ اللہ کا رنگ کہتے ہیں کہ جس سے اچھا رنگ اور کوئی نہیں ہے۔ اطاعتِ رسولؐ کرنے والوں کا پہلا پیار نبیٔ کریم سے نسبت و تعلق رکھنے والی چیزوں سے پیار ہے اور اِس حوالے سے اردو نعت میں جو مقام دیارِ رسول کا ہے، آپ کے شہر کی گلیوں کا ہے وہ کسی اور جگہ کا نہیں ہے۔ اردو نعت میں مدینۃ الرسول کا ذکر کئی حوالوں سے ہُوا ہے - خاص طور پہ گنبدِ خضرا کے حوالے سے مگر یہ ایک الگ موضوع ہے اور اردو نعت میں اِن دونوں موضوعات اردو نعت میں دیارِ رسول کا ذکر اور اردو نعت میں گنبدِ خضرا کا ذکر، مقالات و مضامین لکھے گئے ہیں۔ بعض شعرا نے مدینے کا ذکر اپنی ذاتی خواہشات کے حوالے سے، خاص طور پہ جس میں مدینے کی گلیوں میں جا بسنے اور وہاں کے ہو جانے کا روایتی ذکر ملتا ہے، کیا ہے۔ مگر اِن کے ہاں تو احادیثِ رسول کا حوالہ بھی ہے اور نہایت عقیدت مندی اور پورے ہوش و حواس سے اُس دیارِ عشق کا ذکر ہے۔ ریاض ندیم نیازی کی نعت میں بھی مدینے کا ذکر روایتی حوالے سے آیا ہے مگر انھوں نے مدینے کا ذکر کرتے ہوئے کسی دوسری خواہش کا اظہار نہیں کیا بلکہ ایک ہی جذبے، خیال اور احساس سے اس موضوع میں رنگا رنگی پیدا کی ہے۔ اِن کے ہر شعر میں ایک نیا جذبہ ایک ہی خواہش کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اِن کا مدینے کو مدام دیکھنا اور ہمیشہ کے لیے وہاں جا بسنے کی تمنا ہی اِن کے عشق اور دیارِ رسول سے عقیدت کی انتہا ہے۔ اِن کی پہلی اور آخری خواہش اور آرزو ہی مدینہ ہے۔ اِس حوالے سے اِن کے اشعار میں اِن کی عقیدت و محبت کے سارے زاویے واضح دکھائی دینے لگتے ہیں۔

سیرِ دنیا کی کہاں دل میں تمنا ہے ندیمؔ
تا قیامت میں لگاتار مدینہ دیکھوں
(چمن زارِ حمد و نعت، ص:51)

اے کاتبِ تقدیر مدینہ ہی لکھا جائے
یعنی جو لکھی جائے مکرّر مری قسمت
(چمن زارِ حمد و نعت، ص:147)

یہی آرزو تھی میری، یہی آرزو ہے میری
مرا مستقل ٹھکانہ وہی اک دیار ہوتا
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:51)

دیارِ رسولؐ کا دوسرا حوالہ در رسول پہ حاضری ہے۔ اِن لمحات کو ہمارے نعت گو شعرا نے کئی فکری زاویوں اور روحانی لذتوں سے بیان کیا ہے۔ اِس لمحے کو لفظوں میں قید کر کے بیان کرنا یوں تو ناممکن ہے مگر جس سے اُس وقت جو ہو سکا جو کسی کے دل پہ گزری اُس کو بیان کر دیا مگر اِس قلبی و ذاتی واردات میں نعت کا رنگ دکھ دنیا گنبدِ خضرا کی عظمتوں کو حوالہ بنا

کر اپنی قسمت کے ستارے کو عروج پہ دیکھنا یہ بھی ریاض ندیم نیازی کا کمال ہے۔ اِس حوالے سے اِن کے دو اشعار دیکھیں:

رنگ ، خوش بو ضیا دیکھتے رہ گئے
روضۂ مصطفیٰؐ دیکھتے رہ گئے

میری بینائیاں عرش سے جا ملیں
دیدہ ور آئینہ دیکھتے رہ گئے
(خوش بوتری جوئے کرم، ص:138)

عدم سایۂ رسول کے فکری زاویے سے عقیدت اور عقیدے کے حوالے سے لکھی گئی نعت میں سائے کو محاوراتی حوالے سے شعرا نے بڑی معنوی وسعت دی ہے۔ گو کہ اِس میں اِن کا پہلا اور بنیادی خیال یہی ہے کہ نبیؐ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا اور اگر اِس بات کو خصائصِ رسولؐ کریم کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بات مکمل طور پر سچ دکھائی دیتی ہے کہ اللہ رب العزت نے آپ کو بنایا ہی سب سے افضل اور اعلیٰ ہے عدم سایۂ رسول عربی فارسی اور اردو نعت میں شعرا نے کئی زاویوں سے فکری اور فلسفیانہ حوالوں سے بیان کیا ہے اور اِس میں ایسے خوب صورت اور اچھوتے مضامین نکالے ہیں کہ دل بار بار انھیں پڑھنے کو چاہتا ہے۔

ریاض ندیم نیازی نے بھی اِسی ایک لفظ سایہ کو دو معنوں میں تو کہیں محاورۃً بڑی خوب صورتی سے نبھایا ہے۔ انھوں نے اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہوئے اپنا عقیدہ بھی بتایا ہے اور اِس پہلو سے نیا معنوی انداز بھی تخلیق کیا ہے۔

یہ حقیقت ہے نہ سرکار کا سایا تھا ندیم
میں تو عالم میں فقط آپ کا سایا دیکھوں
(چمن زار حمد و نعت، ص:51)

کہتے ہیں سب حضور کا سایہ نہ تھا مگر
پھیلا ہُوا جو ہم پہ ہے، سایہ حضور ہیں
(ہوئے جو حاضر در نبی پر، ص:107)

اسی خاطر خدا نے تم کو بے سایہ کیا پیدا
نہ کرنا تھا جہاں میں اور کوئی دوسرا پیدا
(خوش بوتری جوئے کرم، ص:125)

ناموسِ رسالت و تحفظ ختم نبوت کا موضوع اِس عہد میں ہماری نعت میں بنیادی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور اگر گہری نظر سے نعتِ رسول کریم کا مطالعہ کیا جائے تو ہماری نعت کی اساس ہی عظمتِ رسول، ناموسِ رسالت، ذکرِ ختمِ نبوت اور اطاعتِ خیر البشر ہے۔ اب انھی موضوعات سے کئی ذیلی اور ضمنی مضامین نکلتے ہیں۔ حُرمتِ رسول کے حوالے سے جان قربان کرنے کا آغاز اُسی دن ہو گیا تھا جس دن دشمنانِ نبوت نے آپ کی زندگی میں اور آپ کے بعد جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ تو جاں نثارانِ نبوت نے اپنے عمل سے یہ سچ کر دکھایا کہ شمعِ ہدایت کے پروانے جان دینے

سے کبھی گھبراتے نہیں ہیں بلکہ اپنی جان قربان کر کے ہمیشہ کی زندگی پاتے ہیں۔ اُس دن سے آج تک مسلمانوں کی یہ زبان جس میں نعت لکھی گئی ہے یا لکھی جا رہی ہے ناموسِ رسالت پہ جان قربان کرنے کا ذکر بڑی شدت سے ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

تیری ناموس پہ کر دیں گے نچھاور ہستی
شانِ آقا تری رحمت کی قسم ہے ہم کو
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:142)

ریاض ندیم نیازی کی ہر نعتیہ کتاب اپنے اندر تخلیقیت اور معنویت کے کئی نئے رنگ سمیٹے ہوئے ہے۔ اِن کی تخلیق نعت میں وہ جذبہ اور احساس بھی واضح دکھائی دینے لگتا ہے جو اُن سے نعت لکھواتا ہے۔ موضوعات کا تنوع اِن کے غور و فکر، مطالعہ سیرت اور سہلِ ممتنع میں نعت لکھنا اِن کے فن کو تازگی بخشتے ہیں۔ یوں تو اِن کی ہر کتاب میں فن کے نئے زاویے دکھائی دیتے ہیں مگر غالبؔ کی زمینوں میں کہی ہوئی نعت جو کہ [جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں] کے نام سے شایع ہوئی، اِس میں اِن کا فن کھل کر سامنے آیا ہے۔ موصوف نے فنی حوالے سے غالبؔ کے کچھ مصرعوں پہ یوں طرحی مصرعے کہے ہیں جیسے اُن کی تخلیقی توانائی اور فنِ نعت گوئی کے سارے رنگ اِن میں ڈھل گئے ہوں۔ انھوں نے مرزا غالبؔ کے مشہور و معروف مصرعوں پہ طبع آزمائی کر کے اپنے آپ کو استادِ نعت گو شعرا میں شامل کر لیا ہے۔ ریاض ندیم نیازی کے اِس مجموعۂ نعت [جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں] میں فکر و فن کے کئی نئے امکان دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں انھوں نے سادگی اور چھوٹی بحر میں غالبؔ کی زمین میں لکھا ہے وہاں وہی رنگ اپنایا ہے جو کہ مرزا غالبؔ کا ہے اور اِسی طرح دوسری زمینوں میں لکھتے ہوئے موصوف نے فن کا راستہ اپنایا ہے۔ اِس حوالے سے اِن کے اشعار کی کچھ مثالیں دیکھیں۔

سچ تو یہ ہے کہ محمدؐ کی غلامی کے بغیر
"آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:49)

وہ کہاں اور میری نعت کہاں
"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا"
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:63)

از طفیلِ رحمتِ محبوبِ ربُّ العالمیں
"مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں"
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:110)

روضۂ مصطفیٰ پہ افسردہ
"کوئی صورت نظر نہیں آتی"
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:153)

اِسی طرح موصوف نے کچھ مصرعوں میں تصرّف کیا ہے۔ تخلیقی حوالے سے اِس میں بہت خوب صورتی ہے۔ موصوف

نے ایک خیال کو نعت کا جامہ یوں دیا ہے کہ نعت پڑھتے ہوئے تغزل کا مزہ بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ بنیادی طور پہ ایسے تجربات ہی اردو نعت میں فنی اور فکری حوالے سے وسعت لا رہے ہیں۔ اِس حوالے سے ریاض ندیم نیازی کے دو اشعار دیکھیں:

مست ہو جاتا ہے عشقِ مصطفیٰؐ سے جس کا دل
کھیل ہو جاتا ہے لانا اس کو جوئے شیر کا

وہ مصیبت میں انھیں اپنا صدا دینا سدا
ٹوٹ جانا وہ ہمارے پاؤں کی زنجیر کا
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:37/33)

اردو نعت میں دیارِ رسولؐ میں بسنے کے حوالے سے شعرا نے جو نیا پن اختیار کیا ہے وہ اپنے شہر کا حوالہ ہے۔ اِس اعتبار سے اردو نعت کا مطالعہ ایک الگ مضمون کا مواد بھی رکھتا ہے۔ وہ لوگ جو نبیؐ کریم سے عشق و عقیدت رکھتے ہیں آپ کے شہر اور آپ سے نسبت رکھنے والی چیزوں سے پیار کرتے ہیں وہ اپنے وطن سے بھی اِسی لیے پیار کرتے ہیں کہ اپنے دیس اور دیار سے محبت بھی نعتِ رسول ہے۔ ریاض ندیم نیازی نے اِس حوالے سے بار بار اپنے شہر سبی کا ذکر کیا ہے مگر اُن کا مرکز و محور دیارِ رسول ہی ہے جس کا ذکر اِس مضمون میں اِس سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔

میری کشتی کو کنارا چاہیے
میں ہوں سبی میں مدینہ چاہیے
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:17)

خواہش ہے کہ سبی سے چلا جاؤں مدینے
درکار ہے اب مجھ کو زماں اور مکاں اور
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:81)

کاش سبی سے مجھ کو لے جائے
میرے دل کی لگن مدینے میں
(خوش بوتریٰ جوئے کرم، ص:173)

ریاض ندیم نیازی کی نعت میں اُن کی سادگی ہی اُن کی نعت میں تازگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اِن کی نعت میں موضوعات کی وسعت اور سیرتِ رسولؐ کا مطالعہ واضح دکھائی دیتا ہے جو اِن کی نعت کو متوازن اور ٹھہرا ہوا لہجہ عطا کرتا ہے۔ وہ ہر مضمون کو بڑے دھیمے لہجے اور شاداب لہجے میں بیان کرتے ہیں۔ اِن کی بات سیدھی دل میں اترتی ہے۔ انھوں نے صورت سے زیادہ کردار اور سیرتِ مصطفیٰؐ کو نعت میں بیان کیا ہے۔ ریاض ندیم نیازی کا نام عہدِ حاضر کے بڑے نعت گو شعرا میں لکھا اور لیا جاتا ہے۔ آپ جس سلیقے سے مسلسل نعت لکھ رہے ہیں اور اِس میں جذبے اور خیال کا نیا پن لا رہے ہیں وہی اِن کی انفرادیت ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر نثار ترابی - دھیمے مزاج کا ایک شائستہ شخص

اچھی صورت جو خدا دے تو یہ اوصاف بھی دے
حسن تقریر بھی ہو خوبیٔ تحریر بھی ہو

.....

چار دہائیوں پر محیط ریاضت پسند تخلیق کار، شاعر، محقق، نقاد جو یقیناً کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات آج سے کوئی آٹھ دس سال قبل پشاور یونیورسٹی میں اردو ڈیپارٹمنٹ کے ایک ڈیفنس کے دوران ہوئی۔ جہاں وہ پی ایچ ڈی اردو کے ایک سکالر کا زبانی امتحان لینے آئے ہوئے تھے۔ ''رکتا نہیں تھا سیل رواں ہمارا'' کے مصداق اپنے الفاظ کے بہاؤ میں بہے جا رہے تھے۔ الفاظ تھے کہ ان کے روبرو کنیز بن کے کورنش بجا لا رہے تھے۔ ایسے میں اور ایسی حالت میں ان کو روکنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ بس ذرا جو وقفہ لیا تو موقع غنیمت جان کر سوال کر بیٹھی۔ مجھ جیسے نالائق کو تو سوال کرنا بھی نہیں آتا اور پھر نثار ترابی سے سوال کرنا یقیناً اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے لیکن میں نے بھی جرأت رندانہ کا سا انداز اپنا کر سوال پوچھ ہی لیا کہ آپ کے ادیب اور شاعر ہونے پر مجھے شک ہے۔ اور اس شک کی وجہ کیا ہے؟ آپ بتائیے؟ ذرا سا ان کا ماتھا ٹھنکا کہ کس گستاخ سے واسطہ پڑا ہے۔ سوال تھا بھی بڑا نازک۔ ہال میں بیٹھی ایک خوبصورت خاتون کو وہ بہن کہہ کے پکار رہے تھے۔ میں نے کہا: ''آپ تو بڑے بدذوق ہیں ''بھلا اتنی خوب صورت خاتون کو بھی کوئی بہن کہتا ہے؟ میرا یہ کہنا تھا کہ اُن پر حیرت چھا گئی۔ جواباً تو خاموش رہے مگر ذرا مسکرا دیئے۔ اس کے بعد ہم سب نے مل کر کھانے کے لیے جب ہوٹل کا رخ کیا تو سارے راستے ترچھی نگاہیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ شاید میری بے باکی پسند آ گئی تھی۔ محفل برخاست ہونے کے بعد شعبۂ اردو کے اساتذہ کرام، ڈاکٹر سلمان علی، ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر

شاہین عمر

سہیل احمد کے ساتھ ساتھ محمد اظہار اللہ اظہار، ڈاکٹر محمد عباس اور دوست احباب نے انھیں راولپنڈی کے لیے رخصت کیا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ ماہ بعد ہی (نوشہرہ) گرلز ڈگری کالج میں لٹریری فورم کی چیئر پرسن بشریٰ فرخ نے 10 کتابوں کی رونمائی کے سلسلے میں نثار ترابی کو مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو کیا۔ میری نثار ترابی سے کل چار پانچ ملاقاتیں صدیوں پہ بھاری ہیں۔ کبھی کبھار ساری عمر کسی کے ساتھ رہ کر آپ اس کو اپنا نہیں کہہ سکتے اور کبھی کبھار ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔

یہ درویش صفت انسان علم و ہنر کا بحرِ بیکراں ہیں - بڑے دھیمے مزاج کے شائستہ انسان ہیں۔ دوسروں کی تعریف کرنا، حد درجہ عزت افزائی کرنا ان کی سرشت میں ہے۔ دورانِ گفتگو الفاظ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے ساتھ آئے ہوئے دوست اکثر و بیشتر سٹیج پر کلام کرنے سے محروم یا تشنہ لب رہ جاتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کتابیں کب اور کس وقت لکھی ہوں گی کیونکہ دن بھر ان کو فون آتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ وہ چہرہ زیادہ پڑھتے ہیں یا کتابیں۔ کسی شاعر نے کہا تھا کہ:

چہرے پڑھتا ہوں کتابیں نہیں پڑھتا اب میں
یہ پڑھائی ہے وہ پڑھائی کہ سبحان اللہ

.....

متعدد نثری و شعری کتابوں کے خالق ہیں۔ میں نے کہیں یہ پڑھا تھا کہ جو لوگ بولتے ہیں ان میں مشاہدے کی قوت بڑی کمزور ہوتی ہے لیکن ترابی صاحب بولتے بھی ہیں مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور مشاہدہ کر کے آپ کو چند منٹوں میں دریافت بھی کر جاتے ہیں۔ جن لوگوں میں بردباری ہو گی وہ اخلاص سے مالا مال ہوتے ہیں۔ بردبار انسان لوگوں کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کر کے اور علیم شخص انسان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ ترابی صاحب بردبار ہونے کے ساتھ ساتھ علیم بھی ہیں۔ اخلاص مند بھی ہیں اور لوگوں کے ساتھ احسان بھی کرتے ہیں۔ جتنا عمدہ کام تحقیق اور تنقید کے میدان میں ترابی صاحب نے کیا ہے ان کے قریبی معاصرین میں سے بہت کم نقادوں کے حصہ میں آیا ہے۔ آپ نے علم کے ذریعے انفرادی اور اجتماعی رجحانات کو پروان چڑھایا۔ جہاں آپ تنقید و تحقیق اور خصوصاً فنِ شاعری میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں وہاں اس فن کو منتقل کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ آپ نے میرے جیسے سیکڑوں کند

ذہنوں کی تربیت کر کے ایک کامیاب علمی و ادبی مستقبل کی جانب رواں دواں کیا ہے۔ یہ وہ چشمہ ہیں جس سے ہر کوئی سیراب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لوگوں کو مادیت کے حصار سے نکال کر جمالیاتی حس کی رعنائیوں سے آشنا کرتے ہیں۔ انھوں نے تسلسل کے ساتھ غزلیں کہیں۔ غزل سے انھیں خاص انسیت ہے۔

رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ "اچھا انسان ہی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔" میں سمجھتی ہوں کہ ڈاکٹر صاحب بھی ایک بہت ہی نفس انسان ہیں۔ 80 کی دہائی میں شاعری کا آغاز کرنے والا ایک اچھا انسان ہونے کے ساتھ ساتھ بہت عمدہ شاعر ہے۔ 1994 میں مائیوں پر مشتمل مجموعہ "بارات گلابوں کی" شائع ہوا، جسے ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی۔ نثار ترابی کا لب و لہجہ شائستہ گفتگو میں رکھ رکھاؤ اور ان کا طرزِ گفتار لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ غزل میں لہجے کی شائستگی دیکھنا ہو تو اُن کا اولین غزلیہ مجموعہ "ہر صدا مسافر ہے" مطبوعہ (2004) مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

سو کچھ ملال نہیں اس کی سرد مہری کا
کہ مثلِ برف وہ پتھر پگھل بھی سکتا ہے

بہت عزیز ہیں یادیں تری مگر اک دن
یہ زہر میرے بدن کو نگل بھی سکتا ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہے اور انہی صلاحیتوں کو وہ بروئے کار لا کر مثبت اور منفی دو طریقوں سے پروان چڑھا کر دنیا میں نام کماتا ہے۔ اللہ نے ڈاکٹر صاحب کو متعدد فکری و فنی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ یہ ان کی انسان دوست افتادِ طبع کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی ذات سے بے پروا کام میں دن رات مگن رہتے ہیں۔ خاص و عام کو اتنی تپاک اور محبت سے نوازتے ہیں کہ دوسروں کو واقعی گمان ہوتا ہے کہ وہ واقعی ان خصوصیات کا حامل ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہوتا، اُن کی اِسی شخصی خوبی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نامور و معتبر شاعر ڈاکٹر توصیف تبسم "نثار ترابی اور اُس کی غزل" کے عنوان سے لکھے ہوئے اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں کہ "نثار ترابی سے میری پہلی ملاقات 1995 میں ہوئی تھی۔ وہ جب اپنے اُردو ماہیوں کی کتاب "بارات گلابوں کی" ازراہ عنایت دینے کے لیے سرسیّد سائنس کالج آئے۔ نثار ترابی کے لب و لہجہ گفتگو میں اُن کے رکھ رکھاؤ اور اُن کے طرزِ گفتار نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ ایک لمحہ کے لیے تو مَیں سوچ میں پڑ گیا کہ اُن کی جنم بھومی موضع دو میل، تحصیل

.....

جنڈ، کہیں لکھنؤ کے نواح میں میں تو واقع نہیں ہے۔ عجیب نستعلیق شخص ہے۔ لگتا ہے بچپنے سے گھر سے ایسی تربیت لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر بھی اپنا خیال نہ رکھنا اس شعر کے مترادف ہے بقول شاعر:

تم ہو میرے عزیز ہیں دفتر ہے دوست ہیں
رشتوں میں بٹ کے میں تو کہیں کا نہیں رہا

.....

علم نفسیات کا باقاعدہ ہے کہ جس چیز سے خطرہ محسوس ہوا سے خوف میں مبتلا کرو لیکن ڈاکٹر صاحب کسی کو خوف میں مبتلا نہیں کرتے بل کہ ہر باصلاحیت شخص کی حوصلہ افزائی کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "انسان جس سے محبت کرتا ہے اُس سے خوف نہیں کھاتا، کیوں کہ جہاں محبت ہے وہاں خوف نہیں ہے اور جو انسان محبت کا جذبہ رکھتا ہے وہ دوسروں کو خوف میں مبتلا نہیں کرتا۔"

شہد صفت لہجہ رکھنے والے ڈاکٹر صاحب بلا کا حافظہ رکھتے ہیں۔ ادھر کسی معروف شاعر کا نام لیا ادھر اُس کا پورا دیوان کیا پورا شجرۂ نصب فرفر سنانے کے لیے تیار۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جوش ملیح آبادی، نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کے ہاں ذخیرۂ الفاظ کی بھرمار ہے۔ اس سلسلے میں اپنی دانست میں سمجھتی ہوں کہ ڈاکٹر صاحب بھی ذخیرہ الفاظ کے معاملے میں اپنے ہزاروں معاصرین سے کہیں آگے ہیں۔ بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کی تحریری و تقریری خوبیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نظم، ماہیے، گیت کی اصناف پر مشتمل شاعری میں کمال تو رکھتے ہی ہیں، لیکن انھوں نے غزل کو اپنا مستقل فن بنایا ہے یہی وجہ کہ آپ نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا عنوان بھی غزل کی صنف سے انتخاب کیا اور "اردو غزل کے عصری رویے" کے عنوان سے اپنا تحقیقی کام کیا۔ خوبصورت لب و لہجہ کا شاعر اپنی مٹی کی محبت میں پورا رچا بسا ہوا ہے اپنی مٹی اور اپنی ثقافت سے اٹوٹ وابستگی ہی ان سے ایسی شاعری تخلیق کراتی ہے۔

ذرّوں پہ جبیں سائیں
مٹی سے محبت کی
حد کوئی نہیں سائیں

.....

وہ اخلاص کا پیکر ہیں اور اخلاص کا لوگ ضرور استحصال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کئی خودغرض قسم کے لوگ آپ کی سادہ دلی سے فائدہ اٹھاتے ہیں یہ وجہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب سمجھتے نہیں سمجھ کر انجان بننے کا جو فن ہے وہ ڈاکٹر صاحب کو خوب آتا ہے

مَیں نے اخلاص کے شیشے میں لہو پیش کیا

☆☆☆☆

ڈاکٹر سید قاسم جلال کا فارسی شعری مجموعہ ''دیوان جلال'' ایک جائزہ

ڈاکٹر سید قاسم جلال کا شمار عہد حاضر کے استاد شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو، پنجابی اور سرائیکی کے علاوہ فارسی زبان میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کی شاعری کا محور محبت، غم، خوشی، اور زندگی کے دیگر پہلوؤں کے بیان کے ساتھ انسانی تجربات اور مشاہدات کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ اشعار میں عموماً گہرے جذبات کا احساس ملتا ہے جو انھیں دور حاضر کے دوسرے فارسی گو شعرا سے منفرد بناتا ہے۔

فارسی کلام میں آپ کا دیوان ''دیوانِ جلال'' کے نام سے ملتا ہے جس پر سخنوران فارس ان کے شعر و فن کے قائل نظر آتے ہیں۔ فکری و فنی اعتبار سے دیوان جلال کو دیکھا جائے تو درج ذیل سخن ہائے نمایاں نظر آتے ہیں:

1- مطلب قرآن و حدیث: دیوان جلال میں جگہ جگہ مطالب قرآن و حدیث ملتے ہیں جن کو ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوبصورتی سے اپنے شعروں میں سمویا ہے۔ دیکھیے:

بر لبِ ما است ذکرِ آیۂ لاتقنطوا
در الم گاہِ خزاں ، کیفِ بہارانیم ما

کجاست اُو کہ زند نعرہ ''قم باذن اللہ''
کہ ہست شہرِ خموشانِ ما ، ہمہ تن گوش

ای جلال ''الفقر فخری'' است فرمانِ رسولؐ
کل مسلماناں بریں فرمان نازانیم ما

2- استعاروں کا استعمال:

فارسی کلام استعارات کے بغیر نامکمل ہے، ڈاکٹر صاحب نے بطور فارسی گو شاعر اپنے دیوان میں فارسی استعاروں کا استعمال نہایت عمدگی سے کیا ہے۔ استعارہ ''کلیم''، ''قصرِ زُجاج''، ''یوسف زلیخا'' وغیرہ کا بیان ان اشعار میں دیکھیے:

پیہم ای کلبہ نشیں ، دستک مکن
سنگ زن ہستند ، در قصرِ زُجاج

در تمام ادوار، ایں دنیا دگر گوں گشتہ است
از کلامِ بے کلیم و از کلیم بے عصا

محمد طاہر حسین قادری

معلوم کن ز قلبِ زلیخا ، بہائی من
نزد تو محض ، یوسفِ دامن دریدہ ام

3- فریادکنندہ:

دیوان یا کلیات میں فریاد و التجا کا مقام اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے، فارسی کے شعرا میں مذہب وملت کے لیے التجا وفریاد کا ذکر دیگر زبانوں کی نسبت زیادہ ملتا ہے۔ سید قاسم جلال اسی روش کو اپناتے ہوئے دیگر مقامات پر اشعار میں التجا کرتے نظر آتے ہیں، مثلا:

ای خدا! ہست التجا، بارِ دگر ، ما را بدہ
صورتِ اقبالِ ثانی ، مومنِ خوددار ، ہیچ

خدای پاک ! عطا کُن تُو ہر مسلماں را
متاعِ دینِ حقیقی و دانشِ نفاع

بیروں بیار خود را از دامِ غیر اقوام
اے مسلمِ پریشاں! ہمت بکن خدا را

4- فلسفہ خودی کا بیان:

سبطِ جمال نے سید قاسم جلال کو اکیسویں صدی کا اقبال کہا، جس کے پسِ پردہ ایک وجہ آپ کے کلام میں علامہ اقبال کی طرح فلسفہ خودی کا بیان بھی ہے۔ خودی کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نیست ممکن، کشف دہر و کشف ذات و کشف حق
گر نہ داری چشمِ بینا ، خواہش عریاں مکن

اگر ز جوہرِ خود ، خاکیاں شوند ، آگاہ
چرا نہ دہر شود ، رشکِ عالمِ ملکوت

ہمیں در آئنہ قلب ، تا شوی آگاہ
ز فرقِ عالمِ ناسوت و عالمِ جبروت

5- قومیت کا درس:

دیوان جلال میں ایک خوبصورت اور فکری عنصر قومیت کا درس ہے جو آپ نے علامہ اقبال کی شعری روش کو برقرار رکھتے ہوئے دیا ہے۔ قومیت کے حوالے سے یہ اشعار اپنی نوعیت کے سادہ اور فکر انگیز شعر ہیں:

جمودِ ساحلِ افتادہ است ، مرگِ دوام
وجودِ زندگی موج است ، با تگ و تاز

صدای وحدتِ ملت ، بکن بلند جلال
کہ ہست عالمِ اسلام ، گوش بر آواز

تُو یاد گیر کہ قومیت است از مذہب
دگر ہمہ وطنیت کند ترا ، خوں خوار

.....

بہر حال "دیوان جلال" اپنے اندر بیش بہا فکری وفنی خوبیوں کو سموئے ہوئے ہے جو یقیناً ڈاکٹر صاحب کی عمر بھر کی علمی عرق ریزی ہے۔ آج کے دور میں ایسا کلام نایاب نہیں تو عام بھی نہیں۔ 'دیوان جلال' کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر ڈاکٹر سید قاسم جلال کے شعری اسلوب کو ایک شعر میں بیان کیا جائے تو انہی کی زبانی یوں ہوگا:

فیض حاصل کردہ ام، از اکبر و حالی، جلال
در تنِ اشعار من، جاں است، اقبالی پیام

☆☆☆☆☆

رائج شعری حدود سے ''تجاوز''

دنیائے شعر میں غلام حسین ساجد نے اپنی ایک بالکل الگ کائنات تخلیق کی ہے اور ''تجاوز'' تخلیق کے اس سفر میں ایک نئی اور انوکھی دنیا کے امکانات کے سراپا سے پردہ اٹھانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ تجاوز میں شامل غزلیں فکر اور تخیل کی وہ کہکشائیں ہیں جو ہمارے لیے ذہنی اور فکری آسودگی کا سامان کرتی ہیں۔

غلام حسین ساجد کی غزلیں جیسا کہ ہم شاعر سے توقع کرتے ہیں اور جس قد کے وہ شاعر ہیں، فنی اعتبار سے نہایت پختہ اور فکری اعتبار سے بڑی نکھری ہوئی سوچ لیے ہوئے ہیں۔ یہ غزلیں قاری کو کسی فکری ابہام کا شکار نہیں کرتی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان غزلوں کا قاری کشادہ فکر و نظر کا حامل ہو۔ اس مجموعے کے مطالعے کے دوران ایک تاثر--- ایک مجموعی تاثر یہ بھی بنتا ہے کہ یہ غزلیں زندگی سے بھرپور ایک جوان شاعر کی غزلیں ہیں جو بدن کی خوشبو کے سحر اور صحبتِ خوش رنگ کے تجربے سے ابھی ابھی گزرا ہے:

جسم کی خوشبو الگ ہے، عطر کی خوشبو الگ
اور اس پر صحبتِ خوش رنگ کا جادو الگ

.....

اس ضمن میں منفرد تخیل اور فکری بالیدگی کے ساتھ ساتھ جسم اور عطر کی الگ الگ خوشبو اور صحبتِ خوش رنگ کا جادو ''تجاوز'' کی ہر غزل میں اپنے وجود کی برتری منواتا نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار کا خمیر فہم و ادراک سے اٹھتا ہے:

یہ آئنہ ہے تو کیوں عکس سے گریزاں ہے
یہ باغ ہے تو یہاں خار و خس ضروری ہے

.....

غلام حسین ساجد نے تجاوز میں پورے مرد کو جتنی عمدگی سے پوٹرے (Portray) کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے:

بدن کے اپنے تقاضے ہیں روح کے اپنے
ورائے عشق ذرا سی ہوس ضروری ہے
یہ راز پایا ہے ساجد بڑی تگ و دو سے
کہ آدمی کی بقا کو مگس ضروری ہے

.....

غالب مگس کے باغ میں جانے کے مضمون کو پروانے کی فنا تک لے کر گیا تھا جب کے غلام حسین ساجد نے اسے آدمی کی بقا کی ضمانت مانا ہے---

جدید علوم کی تمام تشریحات ساجد صاحب کی تائید میں کھڑی نظر آتی ہیں---

اپنی نسل کی بقا کے لیے مگس کا پھولوں میں آنا---- (Zoology)

پھولوں کی بقا کے لیے ان کے پولینیشن میں اس کا کردار--- (Botany)

اور ظاہری اور باطنی معنوں میں اس کا نسل

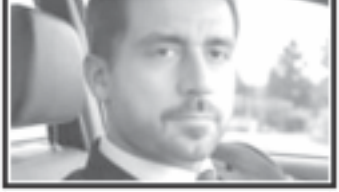

بشیر احمد حبیب

انسانی سے تعلق ---(Philosophy)
ان بڑے مضامین کو ساجد صاحب نے دو مصروں میں باندھ کر پڑھنے والے کو جو فکری آسودگی عطا کی ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ ان کے ہاں متنوع فکری مشاہدات، تخیل کی پرواز کے ساتھ ساتھ بدن کی سیر اور وجود پر دسترس ایک مستقل مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں جو تجاوز کی غزلوں میں خوبصورت استعاروں اور تشبیہات کے ساتھ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ سلیم احمد کہتے ہیں: عورت کی مانند شاعری بھی پورا مرد مانگتی ہے اور اس سلسلے میں غالب پہلا شاعر ہے جس نے اردو شاعری کو پورا مرد دیا۔ تجاوز کی غزلیں مجھے یہ کہنے کی سہولت فراہم کر رہی ہیں کہ غلام حسین ساجد غالب کے بعد پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو پورا مرد دیا۔ شاعری میں فکری تخیل کے حوالے سے جو اعلیٰ معیار مقرر ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ فکر اپنے لیے بدن تلاش کرے اور شاعر اپنے فکری تخیل اور لفظوں کے باہم اختلاط سے معنی کے نئے جہان پیدا کرے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اعلیٰ شعر ہر دو مصروں میں ہمیں ایک نئی ڈائمینشن سے بھی روشناس کراتا ہے۔

جب ہم تجاوز کے اشعار کو ان فکری و فنی اور تخیلاتی معراج کے معیارات پر پرکھتے ہیں تو ایک کے بعد ایک شعر اس کسوٹی پر پورا اُترتا نظر آتا ہے۔ ساجد صاحب کے فکری مشاہدات اور ان کا تخیل ہمیں نئی جہتوں اور سمتوں سے صرف آشنا ہی نہیں کرتا، بلکہ اپنی طرف بلاتا محسوس ہوتا ہے۔ شعر میں درکار عناصر کا اس سطح پر اختلاط کم کم دیکھنے کو ملتا ہے:

شام جو دھوپ چرا لیتی ہے جاتے جاتے
جمع کرتی ہے کہاں اور اڑاتی ہے کہاں

کچھ خبر بھی ہے تجھے یار کہ دھڑکن دل کی
ڈوب جاتی ہے کہاں اور ابھرتی ہے کہاں

.....

حسنِ خوباں ہلال و بدر کی طرح
کبھی کم ہے کبھی زیادہ ہے

.....

تجاوز میں فکری مشاہدات اور زندگی کے حوالے سے اُن کے الگ اور انوکھے تجربات تقریباً ہر غزل میں ملتے ہیں:

راستہ اس حال میں کٹتا نظر آتا نہیں
اور ٹھہرنے کی اجازت ساربان دیتا نہیں

.....

بہت شدت لپٹنے میں ہے ساجد
ہمارے پاس اب مہلت نہیں کیا

.....

اور یہ تین اشعار، اگر انھیں علمِ نفسیات کی روشنی میں جانچ پرکھا جائے تو میرے نزدیک انسانی جبلتوں کے ذیل میں سند کا درجہ رکھتے ہیں:

گناہ کرتا ہوں اور نیکیاں کماتا ہوں
میں ہر طرح کی رفاقت نبھائے جاتا ہوں
مری طرح کوئی گردش میں کم ہی رہتا ہے
کوئی دکھائی اگر دے تو مسکراتا ہوں

گزر رہا تھا تو ٹھک سے مجھے خیال آیا
قریب آیا ہوا ہوں تو ہو ہی آتا ہوں
کوئی تو وقت مقرر ہو خود سے ملنے کا
جو ہو سکا تو کوئی ضابطہ بناتا ہوں

تنگیٔ وقت کے پیشِ نظر ایک شعر--- جو تجاوز کے حوالے سے غور و فکر کی دعوت دے رہا ہے--- کے ساتھ اجازت چاہوں گا:

وہ تجاوز جو مرے خواب کی تعبیر بنا
کبھی فرصت میں اسے سوچ کے خندہ کیجیے

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر زاہد منیر عامر کے ''طلب کے لمحے''

''وہ ابھی بیس سال کا تھا۔ جب ترکی اور روس میں جنگ چھڑی۔ ترکی مسلمان ملک اور خلافت عثمانیہ کا وارث، ہندوستان کے مسلمانوں کا دل ترکوں کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ ترکی خلافت کے ادارے کی علامت تھا اور مسلمان، خلافت کے صدیوں پرانے ادارے کو بچانا چاہتے تھے۔ چنانچہ پوری قوم کے ساتھ یہ نوجوان بھی ترکی کی مدد کے لیے بیقرار ہوا۔ اس نے نوعمری کے باوجود ترکوں کی مدد کے لیے ایک انجمن قائم کی جس کے سیکرٹری کی حیثیت سے اس نے تین ہزار روپیہ جمع کر کے ترک بھائیوں کی امداد کے لیے ترکی بھیجا''۔

''سکول اور کالج کے زمانے میں استاد محترم کے احترام کا یہ عالم تھا کہ استاد کو جاتے دیکھ کر اس کے لیے رکنا محال تھا۔ وہ رحیمہ عطار کی دکان پر کھڑا حقہ پی رہا تھا۔ جب استاد محترم سامنے سے گزرے۔ شاگرد اس وقت زردوزی کے کام والا سلیم شاہی جوتا پہنے ہوئے تھا۔ استاد کو سلام کرنے کے شوق میں اس تیزی سے بڑھا کہ ایک جوتا پاؤں سے نکل گیا۔ اس نے کوئی پروا نہ کی اور استاد محترم کے ساتھ ان کے گھر تک جا کر واپس آیا۔ رحیمے نے اس وارفتگی کا سبب پوچھا تو اس نے کہا رحیمے تجھے کیا معلوم کہ شاہ صاحب کا مرتبہ کیا ہے۔''

''جب میں لندن پہنچا تو میں نے اپنے آپ کو ایک عجیب و غریب ملک بالکل غیر مانوس ماحول میں پایا۔ وہاں میں کسی شخص کو نہ جانتا تھا۔ لندن کی سخت سردی اور وہاں کے کہرے سے سخت پریشان ہوا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہی جلد ہی میں اس نئے شہر میں جم گیا''۔ جناح نے ایک بار اپنے اولین سفر لندن کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ وہ جب لندن پہنچا تو پیلے رنگ کا لمبا اور ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اول اول اس کے لندنی ساتھی اس کے لباس کا مذاق اڑاتے لیکن جناح میں ماحول کو سمجھ لینے کی صلاحیت بلا کی تھی۔ اس نے جلد ہی نہ صرف یہ کہ خود کو وہاں کے موسم اور حالات میں ایڈجسٹ کر لیا بلکہ اس کا شمار لنکنز ان کی سب سے خوش لباس

رانا محمد شاہد

شخصیات میں ہونے لگا۔ جناح لنکنز ان کے طالب علم تھے۔ لنکنز ان جس کا انتخاب جناح نے اس وجہ سے کیا تھا کہ اس کے دروازے پر دنیا کی عظیم دستور ساز شخصیات کے نام لکھتے ہوئے سب سے بڑی دستور ساز ہستی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کو تسلیم کیا گیا تھا"۔ "آگرہ جانے والی گاڑی پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف بھاگی جارہی ہے۔ مسافروں کی اکثریت باہر کے چشم زدن میں بدلتے نظاروں کو دیکھنے میں مصروف ہے۔ ایک برتھ پر ایک لمبا چوڑا آدمی پڑا خراٹے لے رہا ہے۔ اس کے خراٹوں کی آواز سے اردگرد کے سارے مسافر پریشان ہیں۔ برتھ کے نیچے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے چار نوجوان خاص طور پر ان خراٹوں سے تنگ آچکے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اسے جگا دیا جائے، کوئی کہتا ہے اسے بھگا دیا جائے۔ سفر جاری ہے اور گاڑی فراٹے بھرتی جارہی ہے۔ نیچے بیٹھے ہوئے چاروں نوجوانوں کی نظر یکا یک ایک ٹوکری پر پڑتی ہے جو برتھ پر سوئے ہوئے مسافر نے برتھ کے ساتھ لٹکا رکھی ہے۔ ایک نوجوان بڑھ کر دیکھتا ہے اور ٹوکری کو نیچے اتار لیتا ہے۔ ٹوکری دیکھ کر چاروں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ لڈو---- تینوں بہ یک زبان پکارتے ہیں اور ساتھ ہی ٹوکری پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے ٹوکری خالی ہوجاتی ہے۔ اب یہ چاروں نوجوان ادھر ادھر لیٹ جاتے ہیں۔ آگرہ آنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے۔ موٹا مسافر اسی طرح ارد گرد سے بے نیاز خراٹے لینے میں مصروف ہے---- آگرہ اسٹیشن پر گاڑی رکتی ہے تو نوجوان ڈرتے ڈرتے گاڑی سے نیچے اترتے ہیں اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اسٹیشن کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں۔ وہ مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ کہیں وہ موٹا مسافر ان کا پیچھا تو نہیں کررہا۔ وہ تو خیریت گزری اور موٹا مسافر آگرہ کے بعد آنے والی کسی اگلی منزل کا مسافر نکلا جو اب تک برتھ پر پڑا ادھر ادھر سے بے نیاز اسی طرح خراٹے لینے میں مصروف تھا۔ ان نوجوانوں میں ایک مستقبل میں کلکتہ کے مشہور اخبار عصر جدید کا ایڈیٹر بننے والا غلام الثقلین نقوی تھا۔ دوسرا مستقبل کا ایک ممتاز انشاپرداز میر محفوظ بدایونی اور تیسرا مستقبل میں تحریک خلافت کا راہنما کہلانے والا شوکت علی لیکن یہ چوتھا نوجوان کون ہے؟" ایک دوست نے مشورہ دیا کہ لاہور چلو وہاں ضرور کوئی کام مل جائے گا۔ چنانچہ وہ لاہور آگیا اور اپنے ساتھیوں کی روٹیاں پکانے کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری کی تلاش میں لاہور کی اجنبی گلیوں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ اسے اسی طرح پھرتے پھراتے پندرہ دن گزر گئے تو ایک دن کسی فٹ پاتھ کر ایک شخص کو گا گا کر کتابیں بیچتے ہوئے دیکھا۔ اس کے دوست نے طعنہ کے انداز میں کہا "تیرے سے تو یہ بھی نہیں ہوسکتا"۔ وہ تن کر بولا تو کیا جانے میں اس سے اچھے شعر جوڑ سکتا ہوں۔ دوست

بولا اگر اس سے اچھے شعر جوڑ سکتے ہو تو کتابیں کیوں نہیں چھپوا لیتے۔ وہ بولا پیسے کہاں سے لاؤں۔ دوست نے کہا شعر تم جوڑو کتاب میں چھاپوں گا۔ منافع برابر برابر۔ معاہدہ طے پا گیا اور اس نے کچے پکے اشعار پر مشتمل آٹھ صفحے کا ایک کتابچہ مرتب کر کے صدیق کے ہاتھ میں تھما دیا۔ صدیق تیز طرار تھا بھاگ دوڑ کر کے اس نے وہ پمفلٹ شائع کر دیا۔ اب بازار میں مجمع لگا کر بیچنے کا سوال درپیش تھا۔ صدیق نے مجبور کیا کہ میں نے رقم لگائی ہے بیچو گے نہیں تو پیسے کس طرح واپس آئیں گے؟ چاروناچار اس نے کتاب بیچنا منظور کر لیا اور سڑک پر کھڑے ہو کر دو چار شعر بلند آواز سے پڑھے۔ اب لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ اس نے بدقت تمام غزل پوری کی اب اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور گلا خشک ہو گیا تھا۔ صدیق نے لوگوں کو متوجہ دیکھ کر کہا۔ ''اس کتاب کی قیمت دو آنے ہے' جو صاحب خریدنا چاہیں خرید سکتے ہیں''۔ لوگوں نے کتابیں خریدنا شروع کر دیں۔ شام تک چار روپے کی کتابیں بک گئیں۔ اب روز اسی طرح مجمعے لگتے اور کچھ نہ کچھ کتابیں بک جاتیں۔ صدیق کو منافع نظر آنے لگا تو اس نے اپنا کام الگ کرنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ چنانچہ وہ اپنے حصہ کی کتابیں اٹھا کر واپس کاندھلے چلا گیا۔ وہ کتابیں جو صدیق سے علیحدگی کے بعد اس کے حصہ میں آئیں، جیسے تیسے بک گئیں۔ اب اس کے باوجود کہ کام چل نکلا تھا اس نے یہ کاروبار ترک کر دیا۔ کیونکہ اس میں اسے مطالعے کے لیے وقت نہیں ملتا تھا اور مطالعہ ہی اس کے لیے مقصد حیات تھا۔ وہ جہاں بھی رہا جس حال میں رہا اس نے مطالعہ کو ترک نہ کیا تو اب اس کام میں وہ مطالعہ کیسے ترک کر سکتا تھا''۔ یہ پانچوں واقعات بالترتیب علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، قائداعظم، مولانا ظفر علی خان اور احسان دانش کے زمانہ طالب علمی کے ہیں اور یہ پانچوں واقعات ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی کتاب ''طلب کے لمحے'' سے لیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں درج بالا شخصیات کے علاوہ سر سید احمد خان، الطاف حسین حالی، مولانا محمد علی، عبید اللہ سندھی، حسرت موہانی اور چودھری افضل حق کی زندگی کے واقعات شامل ہیں۔ اپنے پیش لفظ میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر ان مشاہیر کے زمانہ طالب علمی کے واقعات کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''عام طور سے ہم مشاہیر کی جن تصویروں سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ ان کی پختہ عمر کے مراحل سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ زمانہ جب ابھی وہ سربلندی اور ناموری کے اس مقام تک نہیں پہنچے تھے جہاں اب ہم انہیں دیکھتے ہیں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ شاید اسی لیے نسل نو ان تصویروں کو اپنے لیے قابل عمل نہیں سمجھتی۔ مجھے اپنے دور طالب علمی سے یہ خیال رہا ہے کہ نوجوانوں کے سامنے مشاہیر کی زندگی کے

تشکیلی مراحل کی تصاویر پیش جائیں تو ان کا اثر ضخیم سوانح عمریوں سے بڑھ کر ہوسکتا ہے"۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر سے میرا پہلا تعارف بچوں کا معروف ماہنامہ "پھول" کا اگست 2001 کا شمارہ تھا۔ جس میں رسالے کے درمیانی صفحہ پر ان کا انٹرویو تھا۔ ہم اس رسالے کو ہر ماہ پڑھتے اور اس میں لکھتے تھے۔ اس کے بعد اخبارات میں ان کے کالمز بھی نظر سے گزرتے رہتے تھے۔ پھر تقریبات میں (ویڈیوز) میں انھیں بولتے سنا تو مجھے ان کی گفتگو ان کی تحریروں سے بھی اچھی لگی۔ جس طرح ٹھہر ٹھہر کر اور دھیمے انداز میں وہ گفتگو کرتے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ وہ بولتے جائیں اور ہم سنتے رہیں۔ اس کتاب میں شامل مضامین کو لکھنے کی تحریک کیسے ملی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر زاہد منیر عامر اپنے اولین دیباچے، جو انہوں نے اس ایڈیشن میں بھی شامل کیا ہے' میں لکھتے ہیں۔

"یہ مضامین لکھنے کا خیال اولا اس وقت پیدا ہوا جب میں نے اپنے کالج کے زمانہ طالب علمی میں کالج کے دوستوں میں مطالعہ وتحریر کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ایک ماہانہ مجلّہ البرق کا اجرا کیا تھا۔ البرق کے اجرا سے میرا مقصد نوجوان دوستوں کو ان کے مزاج کے مطابق ایسا تعمیری لٹریچر فراہم کرنا تھا جو ان کی عمر اور ان کے مزاج کے تقاضوں پر بھی پورا اترتا ہو۔ اس وقت یہ مضامین اس لیے نہ لکھے جاسکے کہ میں البرق کے محدود صفحات میں زیادہ سے زیادہ طلبہ کو نمائندگی دینے کے لیے اس میں اپنی تحریریں کم شامل کیا کرتا تھا۔ پھر جب میں کالج سے فارغ ہوا تو اس سلسلہ مضامین کا خیال بھی آہستہ آہستہ محو ہونے لگا لیکن کچھ عرصے بعد اس خیال کے زیر اثر کہ اگر میں کالج سے فارغ ہو گیا ہوں تو کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں طلبہ کی آمد ورفت کا سلسلہ تو جاری ہے اور میرے کالج سے فارغ ہو جانے سے نوجوانوں کو ایسا لٹریچر مہیا کرنے کی ضرورت تو ختم نہیں ہوگئی۔ میں نے ان مضامین کو قلم بند کرنا شروع کر دیا"۔ یہ واقعات دراصل نوجوان نسل کو اپنے ہیروز سے محبت سکھانے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان مشاہیر کا کردار اور کاوشیں تو اہم ہیں ہی' اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے انھوں نے جو سفر طے کیا' اسے جاننا بھی ضروری ہے یعنی زمانہ طالب علمی کا دور، جوانی کا دور جب انسانی جذبات اپنے عروج پر ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کی زندگی کیسی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کا درج بالا واقعہ بتاتا ہے کہ بڑے لوگ بھی بچپن میں عام لوگوں کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ ویسی ہی حرکتیں اور شرارتیں کرنے والے۔ یہاں مجھے محقق غلام حسین ذوالفقار کا دوسرے معروف محقق مشفق خواجہ کو لکھا خط یاد آ گیا۔ جو انھوں نے 22 دسمبر 1991

کو لکھا۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''آپ کے ارسال کردہ کاغذات مع مکتوب ملے۔ اس عنایت کے لیے از حد شکر گزار ہوں۔ ظفر علی خاں اور میر محفوظ علی کا مشترکہ خط پڑھا۔ مخطوظ ہونے میں کیا قباحت ہے۔ جوانی کے دن امنگوں کی راتیں ہوں اور ایک دور دراز ملک میں لنگوٹیے یار ملیں؛ جنھوں نے کالج ہوسٹل اور حیدر آباد میں خرمستیاں کی ہوں تو وہ ایسا فحش خط نہیں لکھیں گے تو اور کیا کریں گے''۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ نوجوانی میں یہ بڑے لوگ بھی عام طالب علموں کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو ان کی ان تھک محنت اور منزل پانے کا جنون ہوتا ہے جو انھیں عام لوگوں سے خاص لوگوں میں پہنچا دیتا ہے۔ ہم اگر چاہیں تو اپنے اکابرین کی زندگی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ کتاب میں پیش کی جانے والی شخصیات کی زندگی آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مشاہیر کے دور طالب علمی کو دلچسپ اسلوب کے ساتھ پیش کیا۔ ''طلب کے لمحے'' میں موجود شخصیات کے واقعات بتاتے ہیں کہ اگر آپ انفرادی سے زیادہ قومی اور اجتماعی زندگی کی ضروریات کو مدنظر رکھیں تو آپ غیر اہم چیزوں یا سرگرمیوں پر وقت ضائع نہیں کرتے۔ نوجوان ان واقعات کی روشنی میں نہ صرف اپنے مسائل کا ادراک کر سکتے ہیں بلکہ اپنی ترجیحات کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں نوجوان نسل میں کتابیں پڑھنے کا شوق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ بچوں کی تربیت میں کتابوں اور چھوٹی لائبریریز کا بڑا کردار ہوتا تھا، جو کبھی ہر گھر میں موجود ہوتی تھیں۔ ''طلب کے لمحے'' جیسی کتابیں آج کے طالب علم کو ضرور پڑھنی چاہییں، اس لیے کہ اس میں علم و شعور بھی ہے اور تاریخ و تہذیب بھی۔

عملی زندگی میں کامیابی کا دار و مدار عموماً نوجوانوں خصوصاً زمانہ طالب علمی کے تجربات و رویوں پر ہوتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں کیے گئے کام اور کارنامے آپ کے مستقبل کا تعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں طالب علمی کے یہ مرحلے یا ادوار اس کے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ان واقعات کے حوالہ جات بھی درج ہیں۔ آخری حصے میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے ''فکری انتشار اور نوجوان'' کے عنوان کے تحت مختصر انٹرویو شامل کیے ہیں۔ ان شخصیات میں مولانا محمد حنیف ندوی، مختار مسعود، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر نظیر صدیقی، ڈاکٹر خورشید رضوی اور میرزا ادیب ہیں۔

کتاب کے مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسے موضوع کا انتخاب کیا، جسے پڑھنا آج کے نوجوانوں کے لیے بہت ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆

رفیع حیدر انجم کے افسانوں کا مجموعہ ''شاید نہیں'': چند تاثرات

رفیع حیدر انجم کا تعلق انڈیا سے ہے جو ایک کہانی کار ہیں اور مسلسل کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ان کی کہانیاں پاکستان اور انڈیا کے مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوتی ہیں۔ پروفیسر کے عہدے پر تھے جو اپنی مدت ملازمت مکمل کر چکے ہیں۔ انڈیا کے ادبی حلقے میں یہ اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ زیر نظر تصنیف ''شاید نہیں'' ان کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے اس سے قبل بھی ان کے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''شاید نہیں'' جس میں افسانے اور پانچ افسانچے شامل ہیں۔ اول افسانہ ''سفر ایک شہر کا'' ہے جس میں چند افراد کی سفر کے دوران اذیت اور نفسیات کی عمدگی سے عکاسی کیا گیا ہے۔ ایک مسافر کی سفر کے ابتدا سے اختتام تک کیفیات کی انتہائی عمدہ ترجمانی کی ہے۔ یہ وہی لکھاری کر سکتا ہے جو کرداروں کی نفسیات کو جانچنے میں مہارت رکھتا ہو۔ دنیا میں بے شمار موضوعات قدم قدم پر بکھرے پڑے ہیں مگر ہر ایک موضوع کو افسانہ نہیں بنایا جا سکتا، نہ ہر کسی موضوع پر لکھا جا سکتا ہے کیوں کہ نہ تو ہمارے ہاں موضوعات کی کمی ہے اور نہ لکھنے والوں کا فقدان ہے، لہٰذا ہر افسانہ نگار اپنے مزاج کے مطابق موضوع چنتا ہے اور اس پر کما حقہ کوشش کر کے قابل مطالعہ اور اثر انگیز بناتا ہے۔ یہ موضوع کا انتخاب افسانہ نگار کے رجحان اور طبیعت کی مطابقت سے معرض وجود میں آتا ہے۔ ان موضوعات میں انسان، اس کی زندگی، زندگی کے نشیب و فراز، تلخیاں، خوشیاں، خواہشات وغیرہ بھی ہو سکتے ہیں۔ رفیع حیدر انجم بھی اپنی طبیعت کے مطابقت سے موضوع چنتے ہیں۔

اس افسانے ''سفر ایک شہر کا'' کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف کہانی خود بیان کرتا ہے اور اس میں کوئی مرکزی اور ثانوی کردار نہیں ہے محض نوجوان سے ہی اس کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے اشارے سے اس افسانے میں گہرے پہلو سے پردہ اٹھایا ہے کہ بس میں ایک دوسرے کو دھکے دینا یقیناً اخلاقی جرم ہے۔ سفر کی اذیت کو کچھ اس طرح تذکرہ کرتے ہیں کہ قاری کو ان تمام کیفیات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''تیز دھوپ میں کھڑا ہوا میں پسینہ سے شرابور ہو رہا ہوں۔ ہر شخص جس سے پریشان ہے اور سب کے چہروں پر ایک ہی سوال لکھا ہوا ہے ---- بس کب آئے گی شاید

کومل شہزادی

ابھی وقت نہیں ہوا۔"

افسانہ "توتلا عباس" اس میں مرکزی کردار عباس ہے جو توتلی زبان اور رنگ و نسل کی وجہ سے دوسروں کے لیے نفرت کا باعث بنتا ہے۔ اس افسانے میں جہاں عباس کی کربناک زندگی کا تذکرہ ہے وہیں غربا کا استحصال ہے۔ مزید برآں اس افسانے میں رنگ و نسل کی تفریق کے متعلق بھی تذکرہ ملتا ہے۔ عباس کا رنگ کالا اور سوتیلی ماں کا ستایا اور باپ کی لاپرواہی اسے لاوارث ہی بنا دیتی ہے جو خاموشی سے مالکن کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ جہاں اس کا استحصال اعلیٰ سطح پر کیا جاتا ہے نہ عباس کو تنخواہ ملتی ہے اور دن رات متواتر کام بھی کرتا ہے۔ اس افسانے میں مشرقی معاشرے کے وہ مظلوم طبقے کا چہرہ عباس کی صورت میں دکھایا گیا ہے جو بے بس ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں بولتا اور نفرت کا شکار بھی ہوتا ہے محض اپنی شکل، رنگ، توتلی زبان اور لاوارث ہونے کی وجہ سے دھتکارا جاتا ہے۔

"عباس ایک اچھا خادم ہے --- گھر کا سارا کام تنہا کر لیتا ہے۔ کسی کام کو کر لینے میں اسے ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ کوئی بات بھلی بری کہہ بھی دو تو چپ چاپ سن لیتا ہے۔"

اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں نامرد، بارش، ادھورا آدمی، بارش کے بعد، سنگتل وغیرہ شامل ہیں۔

افسانچہ "کاش" جس میں ایک سیاسی لیڈر ایک اخبار رپورٹر کو ملک کا غدار کہتا ہے جبکہ اصل میں غدار یہ لیڈر ہوتا ہے۔ اس افسانچے میں ایک گہرے پہلو کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ کیسے سیاسی افراد ملک و قوم کا پیسہ بیرون ملک اپنی اولاد کو مستقل آباد ہونے پر لگا دیتے ہیں اسی قوم کا پیسہ نوچ کر انہیں غدار کہتے ہیں جن کی اپنی اولاد سمیت انہیں سیاسی افراد کے ٹیکسوں سے چولہے پورے کرتے ہیں۔ ان کی طرز زندگی کو دیکھتے ہوئے ہر ٹیکس دینے والا بھی آرزومند ہوتا ہے کہ وہ بھی سیاسی لیڈر رہو۔ سیاسی لیڈر کے دونوں بچے بیرون ملک تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"میں نے دونوں سے کہہ دیا اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ جگہ اب رہنے کے قابل نہیں ہے۔ وہیں نوکری کر لو اور وہاں کی شہریت بھی حاصل کر لو۔"

افسانچہ "بھوک کی رفتار" جس میں رفیع حیدر انجم نے مزدوروں کے حالات اور ان کے جذبات و احساسات کی عمدہ ترجمانی کی ہے۔ مزدور طبقہ اپنی بھوک ختم کرنے کے لیے میلوں دور پیدل چلنے کا سفر کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ تنگدستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر پیدل چلنے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ بھوک مزدور طبقے سے وہ کام بھی کروا لیتی جو ناممکن اور ناقابل برداشت ہوتا ہے۔

"کس رفتار سے چلتے رہے۔ مزدوروں کو یہ سوال اٹ پٹا سا لگا۔ کس رفتار کا کیا مطلب؟ ایک نوجوان مزدور نے کچھ سوچا

پھر بول پڑا بھوک کی رفتار سے۔"

ان افسانچوں کے علاوہ لفٹ کا تبادلہ، آوازیں اور گے شامل ہیں۔ان کے افسانے اور افسانچے زیادہ تر علامتی اور خودکلامی ہیں۔جس میں داخلی کے ساتھ خارجی زندگی کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ان کی خاصیت کہ افسانوں میں معاشرے کی حقیقت کو بہت مہارت سے بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں اور افسانچوں کا خاص وصف کے یہ روزمرہ کے معاملات پر انکی گہری نگاہ ہوتی ہے۔رفیع حیدر انجم ایک حساس دل رکھنے والے فن کار ہیں۔جن کے اردگرد ایک جال بچھا ہوا نظر آتا ہے، ہماری روزمرہ زندگی میں چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہوتے ہیں۔جن کے نتائج دورس ہوتے ہیں ہم ان سے دامن کشاں گزر جائیں لیکن رفیع حیدر انجم ان کرچیوں کو چننے میں مصروف نظر آتے ہیں۔اپنے مشاہدے کی قوت سے ایسے مناظر پیش کیے ہیں جسے تمام قاری آسانی سے دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں۔انھوں نے غیر ضروری جملوں کے استعمال سے اجتناب کرتے ہوئے جامعیت کا خیال رکھا ہے۔اسلوب کا انداز بیاں سادہ اور سلیس ہونے کے ساتھ کچھ پیچیدہ بھی ہے لیکن بہت کم حد تک ہے یہ ہی وجہ ہے کہ یہی انداز افسانوں اور افسانچوں کو مزید نکھارتا ہے اور اس میں دل کشی اور رنگینی پیدا کرتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اصلاحی افسانے جس میں افسانہ نگار کا خاص مقصد اصلاح کا ہوتا ہے چاہے وہ معاشرے کا ہو یا کسی انسان کی اصلاح کا پہلو ہو۔اس قسم کے افسانے اور افسانچے جو غیر معمولی طور پر مقصدیت لئے ہوئے ہوتے ہیں۔خشک پھیکے اور محض پروپیگنڈہ بن کر رہ جاتے ہیں۔اس قسم کے افسانے عام طور پر کسی اخلاقی نظریات یا تبلیغ مذہب کے لیے لکھے جاتے ہیں۔

انہوں نے اپنے افسانوں میں الگ راہ نکالنے کی بھرپور کوشش کی اور یہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔زبان وبیان کے لحاظ سے بہترین افسانے اور افسانچے ہیں۔ان کی زبان پر بھرپور گرفت محسوس ہوتی ہے۔یہ زبان وبیان کی تراش خراش میں انفرادیت رکھتے ہیں۔انھوں نے چیزوں کو بڑی عمیق نظر سے دیکھا ہے اور انہیں اپنے ذہن کے کینوس پر نقش کرتے چلے جاتے ہیں اور باریک بینی سے اسے افسانوں کا حصہ بنا دیا ہے۔

پختہ اسلوب اور منفرد بیانیہ قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہے۔ مقصود دانش کی رائے سے میں بھی اتفاق کرتی ہوں جو ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"افسانوں میں منطق وفلسفہ کے بجائے افسانہ نگار نے انسانی نفسیات کی گرہوں کو موثر طریق سے کھولنے کی سعی کی ہے۔"

☆☆☆☆☆

افسانوی مجموعہ ''ہم خاک نشیں!''

اردو ادب کا ریگزار نہایت وسیع اور زرخیز ہے جہاں اردو ادب نے بڑے بڑے داستان گو اور ناول نگار پیدا کیے تو وہاں ہر صدی میں بڑے بڑے افسانہ نگاروں کو بھی جنم دیا۔ اگر چہ اردو افسانہ نگاری کی ابتدا 1905 میں پریم چند کے افسانے ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' سے ہوئی مگر صنف افسانہ نگاری کہ شہرت میں کوئی کمی دکھائی نہیں دیتی بلکہ پریم چند کی حقیقت نگاری کی تقلید میں بڑے بڑے امام ابھر کر سامنے آئے۔

اردو ادب کی پرچھائیاں برصغیر پاک و ہند کے دوسرے علاقوں کے نسبت خیبر پختون خوا میں ذرا دیر سے پڑیں یہی وجہ ہے کہ یہاں افسانے کا آغاز بھی بعد میں ہوا۔ 1947 تک خیبر پختون خوا، کا افسانہ کوئی مضبوط حوالہ نہیں رکھتا اس لیے 1947 تک یہاں اردو افسانے کا کوئی بڑا نام سامنے نہ آسکا۔

خیبر پختون خوا کے مشہور افسانہ نگاروں میں مبارک حسین عاجز، کلیم افغانی، رضا ہمدانی، نذیر برلاس، فارغ بخاری اور مظہر گیلانی کے نام اہم ہیں جب کہ اکیسویں صدی افسانہ نگاری کے حوالے سے پختون خوا میں کلیم خارجی اور خالد سہیل کی صدی ہے۔ پختون خوا میں یہی سلسلہ بڑھتا ہوا محمد جمیل کا چوخیل تک آتا ہے۔

محمد جمیل کا چوخیل کا تعلق پاکستان کے سوئزر لینڈ سوات (ملاکنڈ) سے ہیں۔

مجھے اس بحث میں پڑنا ہی نہیں کہ جمیل کا چوخیل بڑا افسانہ نگار ہے یا وہ افسانہ نگاری سے دامن بچا لیتا تو اردو افسانے کا دامن کتنے گہر ہائے آب دار سے محروم ہو جاتا، مجھے بس یہ اعتراف کرنا ہے کہ اس کے اسلوب میں ایک سحر انگیزی ہے جمیل کا چوخیل کے افسانوں میں اس کی شخصیت کا ظاہر اور باطن گندھا ہوا ہے اگر چہ ان کا اسلوب نہایت سادہ سلیس ہے مگر ان کے افسانے کمی کے دانے ہیں جذبوں کی ذرا سی آنچ ملنے پر اس کے لفظ سفید

نوید عائل

پھول بن کر اچھلتے ہیں۔ ان کے افسانے ایک طرف تو زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں دوسری طرف انسانی جذبات اور معاشرتی مسائل کو بڑی دیانت داری سے بیان کرتے ہیں ان کا اسلوب سادہ ضرور ہے مگر ان کی تحریروں میں گہرائی اور بصیرت پائی جاتی ہے جو قاری کو نہ صرف محظوظ کرتی ہے بلکہ زندگی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے ان کے افسانے مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک مکمل دنیا رکھتے ہیں ان کے افسانوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ محمد جمیل کا چوخیل پریم چند کا زبردست مقلد ہیں کیوں کہ جس طرح پریم چند نے مسائلی افسانے نہیں لکھے بلکہ انسانوں کی کہانیاں لکھی ہیں اسی طرح کا چوخیل نے بھی سچے واقعات کو افسانے میں قلمبند کیا ہے۔ ''ہم خاک نشیں!'' محمد جمیل کا چوخیل کی تخلیقی مسافت کا چوتھا اہم پڑاؤ ہے اس سے قبل آپ کا ''نوحہ بے نام''، ''جلتا سِرا سُلگتی روح'' اور ''میرا برزخ'' کے نام سے افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔

''ہم خاک نشیں'' عنوان ہی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ جمیل کا چوخیل نے زندگی کو فریب سمجھا ہے زندگی کے ہر پہلو کو دیکھتے ہیں اور اس میں خود کو شامل کر کے الفاظ کا جامعہ پہنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ ہم خاک نشیں میں (19) افسانے شامل ہے ان تمام افسانوں میں حقیقت نگاری اور موضوعات کا تنوع عروج پر ہے ان افسانوں کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے جیسے مصنف روبرو آپ سے مخاطب ہو جب کہ بعض اوقات افسانوں میں آپ کا قلم ایک بے رحم نقاد کا کردار ادا کرتا ہے۔

☆ حقیقت پسندی

جمیل کا چوخیل کی تحریروں میں حقیقت پسندی کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کے افسانے عام لوگوں کی زندگیوں کے گرد گھومتی ہیں اور معاشرتی و سماجی مسائل کو بڑی دیانت داری سے بیان کرتے ہیں۔

جیسے افسانہ'' اندھیرا اُمتی کا جگنوں'' میں رقم طراز ہے کہ ''دن بھر کے لیے تھکے ہوئے چُور چُور ابدان واذہان کے لیے وقت آرام ہے مگر مجھ جیسوں کے لیے ساعت حرام ہے۔ کیوں کہ یہی ہمارے کاروبار کا وقت عمل ہے میں اندھیروں کی سوداکاری ایجنٹ ہوں بیوپارن ہوں میرا کاروبار تاریکی کی کوکھ میں پلتا ہے تاہم مجھے روشنی اور تاریکی سے نہ کوئی فرق پڑتا اور نہ ہی خوف آتا ہے''

☆ موضوعات کی وسعت

جمیل کا چوخیل کے افسانوں میں موضوعات وسیع ہیں۔ ان کے یہاں معاشرتی مسائل، طبقاتی کشمکش، انسانی فطرت، محبت و نفرت، غم اور خوشی سبھی کچھ موجود ہے خاص طور پر وہ اپنے افسانوں میں زندگی کے ہر پہلو کو بڑی گہرائی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے کئی افسانوں کے عنوانات ایسے ہیں کہ نام ہی سے قاری کے ذہن و دماغ میں طرح طرح موضوعات آتے ہیں

جیسے "جال سے دجال تک"، "سہ حرفی" "ن"، "نشاطِ تنہائی" وغیرہ۔

☆ کردار نگاری

ہم خاک نشیں میں جمیل کا چوخیل کی کردار نگاری عام لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں انھوں نے اپنے کرداروں کو حقیقی زندگی کے لوگوں سے قریب تر رکھ کر پیش کیا ہے۔ آپ نے کرداروں کی نفسیات اور ان کی سوچ کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے جس سے قاری کو ان کرداروں کے ساتھ ایک جذباتی لگاؤ محسوس ہوتا ہے۔

"لیکن دلشاد بیگم جو کہ ایک طوائف تھی اس کو اپنی کشش، اپنے حسن، عشوہ، غمزہ اور اداؤں پر غرور تھا۔ ایک رات صرف ایک رات کی کمائی اس نے بڑی حقارت سے اپنے بستر پر پھینکی اور کہا کہ بڑی سے بڑی رقم بھی میری کشش، حسن اور جوانی کے مقابلے میں بے حیثیت اور بے توقیر ہے"

☆ سادگی اور اختصار

ہم خاک نشیں میں تمام افسانے سادہ اور مختصر ہیں ان میں غیر ضروری تفصیلات سے گریز کیا گیا ہے اور کہانی کے اصل جوہر پر توجہ دیا گیا ہے ان کے افسانے آسانی سے سمجھ میں آتے ہیں اور قاری کو متاثر کرتے ہیں۔

☆ علامت نگاری

محمد جمیل کا چوخیل نے اپنے گرد و پیش جو دیکھا ہے چاہے وہ معاشرتی و سماجی نا انصافی ہو یا طبقاتی کشمکش، ظلم و جبر ہو یا غربت کا المیہ زندگی کے ان تلخ واقعات میں کا چوخیل نے خود کو شامل کر کے علامتی انداز میں پیش کیا ہے ان کے اکثر افسانوں میں علامت نگاری کا سہارا لیا گیا ہے۔

"لٹو مظبوط جسامت کا دلچسپی اور انتہائی وفادار کتا تھا وفاداری بلکہ غلامی شاید یہاں خمیر میں ہے اس لیے بدیسی نسلی کتوں کے مقابلے میں دیسی کتے زیادہ وفادار ہوتے ہیں بہ شرط یہ کہ ان کے سر پر ہاتھ پیرا جائے"

یا اسی افسانے میں (انسان کہیں کا) میں آگے لکھتے ہیں کہ

"لٹو اپنی وفا کی جبلت کے زیر اثر گاڑی کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ بے زبان یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا مالک اب صمد نہیں بلکہ ملک عبدالصمد خان ہے۔ کتا تو اس کے لیے کتا ہی تھا اس نے تو اپنے نئے سماجی مرتبے کے لیے اپنے سگے رشتہ داروں اور دوستوں تک سے آنکھیں پھیر لی تھی۔ اس کی عالی شان کوٹھی اور متکبر دل میں اب کسی گلیا سے دیسی کتے، غریب رشتہ دار یا کسی پرانے مفلس دوست کے لیے کوئی جگہ نہ بچی تھی"

عام طور پر جب بھی کوئی افسانہ نگار افسانہ لکھنے کا قصد کرتا ہے تو سب سے پہلے افسانے کے لیے پلاٹ بنتا ہے یعنی کہانی تیار کرتا ہے مگر ہم خاک نشیں پڑھنے کے بعد اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ جمیل کا چوخیل کسی سچے واقع یا کہانی کو افسانے کا روپ دیتے ہیں یہی وصف جمیل کا چوخیل کو دیگر افسانہ نگاری سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

سورہ العصر اور سیکنڈ لاء آف تھرموڈائنامکس:

فزکس کے ایک انتہائی ادنیٰ طالبعلم کی حیثیت سے میرا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو سائنس کو مذہب سے متصادم نہیں سمجھتے۔ میری رائے میں سائنسی علوم کسی نہ کسی درجے پر دراصل اُسی **divine oneness** کی طرف لیجاتے ہیں جسکا اظہار مذہب مختلف انداز میں کرتا ہے۔ اگر دینِ اسلام کی بات کی جائے تو ہمارا دین مکمل اور آفاقی ہے اور قرآنِ مجید وہ آفاقی کتاب ہے جس نے سائنس کو بھی ایک ذیلی علم کے طور پر اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔

زیرِ مطالعہ آرٹیکل میں راقم الحروف نے جسارت کی ہے کہ فزکس کے قوانین خصوصاً سیکنڈ لاء آف تھرموڈائنامکس کو سورہ العصر کے تناظر میں پرکھا جائے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ اگر سادہ لفظوں میں سیکنڈ لاء آف تھرموڈائنامکس کو بیان کیا جائے تو اس کے مطابق کائنات کے اندر موجود کوئی بھی مادی سسٹم دراصل آرڈر سے ڈس آرڈر یعنی ترتیب سے بے ترتیبی کی طرف رواں ہے اور اس بے ترتیبی کو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک کم تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے ریورس نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے پانی کے اندر کسی بھی خاص ترتیب سے رنگوں کی آمیزش کرلیں تو اُس آمیزش کو **undone** نہیں کیا جا سکتا۔ لکڑی جل کر کوئلہ بننے کے عمل کو آہستہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن سوختہ لکڑی کی راکھ کو واپس لکڑی نہیں بنایا جا سکتا۔ اس انرجی، فریکوئینسی اور وائبریشن پر مُشتمل کائنات کے اندر ہماری اس تھری ڈائمینشنل دُنیا کا سفر بھی ہمیشہ سسٹم کے آرڈر سے ڈس آرڈر کی طرف ہی گامزن رہے گا۔ اگر خالصتاً فزکس کی زبان میں بیان کیا جائے تو سیکنڈ لاء آف تھرموڈائنامکس کی تعریف کچھ یُوں ہوگی:

"The total entropy of a system either increases or remains constant in any spontaneous process; It never decreases."

فزکس کی اصطلاحات سے نابلد دوستوں کے لیے **entropy** کی وضاحت بھی کرتا چلوں کہ

"Entropy is the measure of the

عمران حیدر تھہیم

disorder of a system."
یعنی کسی بھی سسٹم کے اندر وقوع پذیر ہونے والے ڈس آرڈر یا بے ترتیبی کو entropy کہتے ہیں۔
بات کو مزید سمجھنے کیلیے آیئے فرسٹ لا آف تھرموڈائنامکس کا بھی اعادہ کر لیتے ہیں جس کے مطابق

energy cannot be created or destroyed; it can only be converted from one form to another.

یعنی توانائی کو نہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ختم کیا جا سکتا ہے اسے صرف ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی کائنات کی مجموعی توانائی ہمیشہ مستقل رہتی ہے اور بڑھتی یا کم نہیں ہوتی۔
چنانچہ فزکس کے ان دو اہم قوانین کی رُو سے یہ بات ایک مُسلّمہ حقیقت بن چکی کہ یہ کائنات جو دراصل مادہ اور توانائی کے باہمی ربط اور ملاپ سے بنی ہے اس کے اندر مادہ اور توانائی صرف حالتیں بدلتے ہیں اور مجموعی توانائی مستقل رہتی ہے، کم یا زیادہ نہیں ہو سکتی اور جس بھی سسٹم کے اندر انرجی کارفرما ہے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ آرڈر سے ڈس آرڈر کی طرف سپیس میں محوِ سفر رہے گا۔
پس ہر مادی شے فنا کہ طرف گامزن ہے۔

اب آتے ہیں اِس کائنات کی مختلف پراڈکٹس یعنی مخلوقات کی طرف۔ جس میں ہم انسان بھی شامل ہیں۔ سائنس کی رُو سے کائنات کے اندر موجود اب تک دریافت شُدہ تمام 118 عناصر elements میں سے 92 قُدرتی یعنی natural elements ہیں اور باقی 26 مصنوعی یا artificial elements ہیں۔
انسانی جسم ان 92 قدرتی عناصر میں سے کُل 21 عناصر سے مِل کر بنا ہے جن میں سے 6 عناصر آکسیجن، نائٹروجن، کاربن، کیلشیم اور فاسفورس مِل کر انسانی جسم کا 99 فیصد بناتے ہیں اور باقی 1 فیصد جسم 15 دیگر عناصر سے مِل کر بنا ہے۔ انسانی جسم کُل تقریباً 10^27×7 (7 ضرب 1 کے ساتھ 27 زیرو) ایٹموں سے مِل کر بنا ہے اور سائنس کی رُو سے اتنی تعداد کے عناصر اور اتنی تعداد کے ایٹموں کی ایک خاص ترتیب کے ساتھ بنی ہوئی کوئی دیگر پراڈکٹ یا تخلیق اس شکل میں ڈھال کر پیدا کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا سائنس کے مطابق مادہ اور توانائی کی بنی ہوئی فطرت کی وہ پراڈکٹ جو سب سے بہترین ڈیزائن میں ڈھل کر وقوع پذیر ہوئی وہ انسان ہی ہے۔
اِسی سائنسی حقیقت کو قرآن نے یُوں بیان کیا:
"لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم"
"ہم نے انسان کو سب سے بہترین ڈیزائن میں ڈھال کر پیدا کیا۔"

بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اب یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ اس کائنات کی سب سے سمارٹ پراڈکٹ جو کہ مادہ اور توانائی پر مشتمل ہے انسان ہی ہے اور انسان اس تین جہتی مادی دُنیا (تھری ڈائمینشنل ورلڈ) کے اندر low entropy سے high entropy کی طرف جارہا ہے اور سیکنڈ لاء آف تھرمو ڈائنامکس کی رُو سے آرڈر سے ڈس آرڈر پر جاکر منتج یا disintegrate ہوگا۔

یہ بات سورہ العصر میں یوں بیان ہوئی ہے:

"والعصر، ان الانسان لفی خسر ---"

"قسم ہے عصر کی، (یا عہدِ رواں کی یا ڈھلتی عُمر کی یا گزرتے وقت کی) کہ انسان خسارے میں ہے۔"

لہٰذا اگر انسان سمجھتا ہے کہ وہ مادہ اور توانائی کے بقائے باہمی اور تبادلے کے ذریعے کائنات کو تسخیر کرلے گا تو وہ یقیناً بھول میں ہے اور خسارے میں ہے۔ کیونکہ ہر مادی چیز increased entropy سے عبارت ہے۔

دیکھیے کس طرح فزکس کے سیکنڈ لاء آف تھرموڈائنامکس کا تمام فلسفہ سورۂ عصر کی ایک آیت "ان الانسان لفی خسر" میں سمایا ہوا ہے۔ گویا ساری فزکس ایک ہی آیت کی تشریح ہے۔

اسی سورت کی اگلی چار آیات میں چار شرائط کا ذکر ہے کہ "مگر وہ لوگ نہیں جو ایمان لائے، عملِ صالح کرتے رہے، حق بات کی تاکید اور صبر کی تلقین کرتے رہے"۔

ان چاروں خصوصیات کی ماہیت غیر مادی ہے اس لیے اُسے فنا نہیں بلکہ دوام حاصل ہے۔ کیونکہ ایمان کسی مادے سے مل کر نہیں بنا، نہ ہی عملِ صالح کا کوئی یونٹ ہے، حق اور صبر بھی غیر مادی اکائیاں ہیں۔ ان چاروں خصوصیات کی پیمائش کا کوئی سائنسی پیمانہ بھی نہیں ہے۔ یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایمان، عملِ صالح، حق یا صبر کتنے میٹر، لیٹر، کلوگرام یا جاؤل وغیرہ کا ہے۔ ان خصوصیات کا تعلق صرف human spirit سے ہے اور اب تک کی سائنس بھی یہی بتاتی ہے کہ انسانی رُوح اور انسانی شعور کو دوام حاصل ہے۔

عظیم مُسلمان مفکّر و مجدّد حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے مطابق اگر عظیم آفاقی کتاب قرآنِ مجید کا آفاقی پیغام صرف ایک سورت کے ذریعے سمجھنا ہو تو سورۂ العصر کی آیات ہی کافی ہیں۔

میری ذاتی رائے میں اگر دیکھا جائے تو ساری پارٹیکل فزکس ایک ہی قانون یعنی سیکنڈ لاء آف تھرموڈائنامکس میں سمائی ہوئی ہے اور سیکنڈ لاء آف تھرموڈائنامکس کا سارہ فلسفہ سورہ العصر کی دوسری آیت میں سمو کر خالقِ کائنات نے علمِ طبعیات کو قلوبِ انسانی پر منکشف کردیا ہے۔

وما علینا الا البلاغ---

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔
مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔
شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاولپور، ممبر پبلک سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔
ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب "شاہ داستان" تجسس اور تحقیق کے گئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

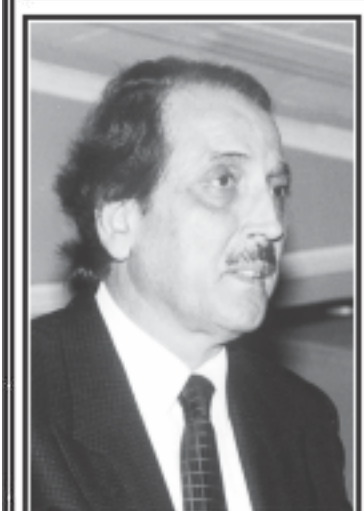

شوکت علی شاہ

اتفاق سے وہ پورن ماشی کی رات تھی۔ چاند اپنے جوبن پر تھا۔ ہم سوئے کم اور زیادہ دیر جاگتے رہے۔ جھیل کے چاروں اور گھومتے رہے۔ چاند بھی جھیل کا گرویدہ لگتا تھا ہمارے ساتھ چہل قدمی کرتا رہا۔ اس کی سنہری کرنیں جب پانی کی اٹھتی ہوئی لہروں سے ٹکراتیں تو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی غیر مرئی ہاتھ نے ملک کا سب سونا جھیل میں اُتار دیا ہو۔ دو بجے رات تک ہم بے مقصد گھومتے رہے۔ آہستہ آہستہ خنکی سردی میں بدلتی گئی۔ سکردو پاکستان کے سرد ترین علاقوں میں سے ایک ہے۔ جب کپکپاہٹ زیادہ بڑھی تو ہم اپنے کمروں میں چلے گئے۔

علی الصبح میں نے جوگرز پہنے اور سیر کرتا کرتا پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ فریدہ اور بریگیڈیئر اسلم کی قبریں ساتھ ساتھ بنی تھیں۔ موت نے سب دوریاں ختم کر دی تھیں سب گلے شکوے جاتے رہے تھے۔ میں نے فاتحہ پڑھا اور پہاڑ سے نیچے اُتر آیا۔

اگلا دن شاہد مجید نے سکردو شہر اور اس کے مضافات کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ سکردو سطح سمندر سے آٹھ/نو ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ کسی زمانے میں یہ ریاست کشمیر کا حصہ تھا۔ شاہ ہمدان بھی یہاں پر آئے تھے۔ ان سے منسوب چند یادگاریں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اہل کشمیر کی طرح وہاں کے لوگ بھی ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ سکردو کی تاریخ کشمیر کی تاریخ ہے۔ یہ جنت نظیر وادی ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو انگریزوں نے ۷۵ لاکھ نانک شاہی سکوں کے عوض بیچ ڈالی۔ خریدار ایک ڈوگرا گلاب سنگھ تھا۔ ریاست کا رقبہ ۸۴ ہزار مربع میل کے لگ بھگ تھا۔ گلاب سنگھ کی موت کے بعد اس کا بیٹا رنبیر سنگھ گدی نشین ہوا۔ رنبیر سنگھ کا جانشین پرتاپ سنگھ تھا۔ وہ بظاہر غبی لگتا تھا لیکن اپنے مطلب کی ہر بات نہ صرف سمجھتا تھا بلکہ کر بھی گزرتا۔ اس کے متعلق کافی لطائف مشہور ہیں۔ کرکٹ کھیلنے کا شوقین تھا۔ ہر دفعہ میاں نواز شریف کی طرح سنچری بناتا کیونکہ اس نے پرویز مسعود کی طرح ایمپائر کھڑے کیے ہوتے جن کی انگلی کبھی اوپر نہ اُٹھتی۔ اس کا جانشین ہری سنگھ تھا جو ۱۹۲۵ء میں گدی نشین ہوا۔ وہ بدمعاش اور عیاش تو تھا ہی لیکن مسلم دشمنی بھی اس کو ورثے میں ملی تھی۔ اس نے مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے دباؤ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی پچکار کے بعد اس نے ریاست کا الحاق ہندوستان سے کر دیا۔ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جو پاکستان میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ اس طرح کشمیر کا تنازعہ شروع ہوا۔ کشمیر دو حصوں میں بٹ گیا۔ پاکستانی حصہ آزاد کشمیر کہلایا لیکن سکردو اور گلگت کا Status الگ رکھا گیا ہے۔

سیاچین کو جانے والا راستہ بھی سکردو سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک سڑک بابو سرٹاپ اور جھیل لولوسر سے ہوتی ہوئی ناران تک چلی جاتی ہے۔ سڑک پختہ نہیں ہے راستے میں جگہ جگہ برف کے تودے رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ یہ سڑک صرف گرمیوں میں کھلتی ہے سردیوں کے موسم میں بند ہو جاتی ہے۔

سکردو صاف ستھرا چھوٹا سا شہر ہے۔ ہم نے چند گھنٹوں میں نہ صرف دیکھ ڈالا بلکہ اس کا نقشہ بھی سمجھ میں آ گیا۔ شہر میں زیادہ تر بلتی آباد ہیں یہ چینی تو نہیں ہیں لیکن زیادہ تر شکلیں ان سے ملتی جلتی ہیں۔ چھوٹے قد، چپٹی ناک، دھنسی ہوئی آنکھیں، پیلا ہٹ لئے ہوئے سفید رنگ۔

تیسرے دن ہم ایئرپورٹ پر پہنچے تو پتہ چلا کہ جہاز لینڈ نہیں کر سکا۔ سکردو ایئرپورٹ پر لینڈنگ آسان نہیں ہے۔ ایئرپورٹ کے تین اطراف پہاڑ ہیں۔ جہاز پہاڑوں کے درمیان اُڑتا ہے۔ ذرا سی غفلت سے حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ ایک پائلٹ پہلے ہی

دریائی ریت کو رن وے سمجھ کر فوکر اُتار بیٹھا تھا۔ جہاز چھوٹا تھا اس لئے بچت ہو گئی۔ آج کل بوئنگ جہاز آتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ ہم واپس ہوٹل چلے جاتے اعلان ہوا کہ انتظار کریں پائلٹ لینڈنگ کے لئے آخری کوشش کر رہا ہے۔ بڑا سرپھرا پائلٹ تھا۔ اس نے خطرات کی پروا نہ کرتے ہوئے جہاز رن وے پر اُتار دیا۔ مسافروں کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہمیں تو کوئی فرق نہ پڑتا تھا لیکن سیاحوں کو مزید چند دن ٹھہر کر زرِ کثیر خرچ کرنا پڑتا۔ سکردو کا موسم دن میں کئی بار بدلتا ہے۔ سارا دن دھوپ چھاؤں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جہاز چلے ابھی نصف گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ مائیک پر کیپٹن کی آواز اُبھری۔ خواتین و حضرات! آپ اب دنیا کی بلند چوٹی کے اُوپر سے گزرنے والے ہیں۔

کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا تو خوشگوار حیرت ہوئی۔ سر ایڈمنڈ ہلری اور دیگر کوہ پیما جان ہتھیلی پر رکھ کر بمشکل ان چوٹیوں تک پہنچ پائے تھے۔ وہاں جا کر اپنے ملک کے جھنڈے گاڑتے ہیں، اپنی انا کی تسکین کرتے ہیں۔ ہم بغیر کسی تردد اور تگ و دو کے چوٹی پر نہیں بلکہ چوٹی سے ہزار فٹ اُوپر پرواز کر رہے تھے۔ چوٹی ہمارے قدموں میں تھی۔ یہ سب اس اُڑن کھٹولے کا کمال تھا جس پر اُڑنے کے خواب انسان ہزار سال تک دیکھتا چلا آ رہا ہے۔ حفیظ جالندھری نے درست ہی کہا تھا۔ کھل گیا ہے ملک و ملت پر سلیمانی کا راز۔

گوادر: ہمیں شمالی علاقہ جات سے آئے ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ شاہد مجید نے دفتر میں بلا لیا۔ کہنے لگا ”پہلے اچھی سناؤں یا بری خبر؟“

عرض کیا ”ہر بری خبر اچھی خبر کو کھا جاتی ہے اس لیے اوّلیت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ آپ جہاں سے چاہیں شروع ہو جائیں۔“

کہنے لگے ”ایک کا تعلق تمہاری ذات سے ہے اور دوسری ملک و قوم کے بارے میں ہے۔ اچھی خبر تو یہ ہے کہ تم اپنے خوابوں کے جزیرے گوادر میں ایک مرتبہ پھر جا رہے ہو۔ میرے پاس کوئٹہ اور جنوبی علاقہ جات کی آپشن تھی، محض تمہاری خاطر کراچی گوادر کا پروگرام بنایا ہے البتہ دوسری خبر گو عمومی ہے لیکن اچھی نہیں ہے۔ پاکستان عنقریب ”ناکام ریاست“ ڈیکلیئر ہونے والا ہے۔ ہمارے زرِ مبادلہ کے ذخائر خطرناک حد تک نیچے آ گئے ہیں۔ کشکول لے کر نواز شریف ملک ملک نگر نگر پھر رہا ہے لیکن کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ اگر یہی صورت حال رہی تو یقین کرو کھانے کو گھاس تک نہیں ملے گی۔“

عرض کیا ”اگر گستاخی نہ سمجھیں تو دونوں درست نہیں ہیں۔ ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے تو دوسری سراسر خوش فہمی پر مبنی ہے۔ جہاں تک گوادر کا تعلق ہے تو وہ میرے خوابوں کا جزیرہ تھا، اب نہیں ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد خواب چکنا چور ہو گئے ہیں، اُمنگیں اور آرزوئیں مجروح ہوئی ہیں۔ جہاں پینے کو میٹھا پانی نہ ہو، چار سو ریت کی حکمرانی ہو، ہوا میں نمک کا لمس ہو، وہ جگہ راحت جاں کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ نے پاکستان کی بات کی ہے تو اس سے مجھے گلستان سعدی کی وہ حکایت یاد آتی ہے۔ ایک بھوکے گیدڑ نے اُونٹ

کا لکھا ہوا ہونٹ دیکھ لیا تھا جو بڑی تیزی سے ہل رہا تھا۔ اس نے سمجھا کہ وہ کسی وقت بھی گر سکتا ہے۔ اس آس میں وہ میلوں سفر کر گیا۔ ہونٹ تو نہ گرا لیکن بھوک سے نڈھال گیدڑ جان گنوا بیٹھا۔

ہم زمانہ طالب علمی سے سن رہے ہیں کہ پاکستان ناکام ریاست ہے۔ صبح گیا یا شام گیا لیکن ہوتا کچھ نہیں ہے۔ مخالفین حسد اور بغض کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔"

چہرے پر مصنوعی ناراضی طاری کرتے ہوئے بولے "تو گویا تم مجھے گیدڑ سمجھتے ہو۔"

عرض کیا "وہ تو محض ایک مثال تھی نہیں تو آپ نپلیا کے شیر ہیں۔ ہم آج تک اس غلط فہمی میں رہے کہ شیر پنجاب صرف ہمارے ملک غلام مصطفیٰ کھر ہیں۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ آپ میں اور کھر میں صرف ایک فرق ہے۔ آپ دھاڑتے کم ہیں، ملک صاحب کی گھن گرج اخباروں کے ہر صفحے پر سنائی دیتی ہے۔"

کہنے لگے "میں تمہاری بات سے اختلاف نہیں کروں گا لیکن گوادر اب پہلے والا گوادر نہیں ہے۔ وہاں نیول ہیڈ کوارٹر بننے والا ہے۔ فوجی چھاؤنی کی تجویز ہے۔ بہت بڑی بندرگاہ، ٹریڈ سنٹر لوگ دبئی، سنگاپور اور ہانگ کانگ کو بھول جائیں گے۔"

"چاند تو کسی دن آباد ہو سکتا ہے لیکن گوادر دبئی نہیں بن سکتا۔ سیاست دانوں اور سرمایہ کاروں کی ملی بھگت سے عوام کا محنت سے کمایا ہوا پیسہ ریت برد ہو جائے گا۔ اس علاقے کی دہشت، سکندر، سائرس اور سمیرا مس برداشت نہ کر سکے، یہ کس کھیت کی مولی ہیں۔"

بولے "اب تو پروگرام بن ہی گیا ہے، تمہیں طوعاً کرہاً جانا ہی ہوگا۔"

شرکائے کورس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک گروپ کوئٹہ چلا گیا اور ہم نے کراچی کے لیے رخت سفر باندھا۔ شاہد مجید صاحب نے کراؤن پلازہ ہوٹل میں ہماری رہائش کا بندوبست کیا تھا یعنی شرفاء کا بھرم بھی رہ جاتا ہے اور جیب بھی تپش محسوس نہیں کرتی۔ اتفاق سے ہمارا گروپ بھی وہی تھا صرف اس میں نرگس سیٹھی اور رفیق بٹ صاحب کا گراں قدر اضافہ تھا۔ بٹ صاحب کا تعلق بھی پولیس سروس سے ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر نفیس انسان محکمہ پولیس میں کیسے بھرتی ہو گیا۔ شعر و شاعری کے دلدادہ ہیں۔ برمحل اور درست شعر پڑھنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ نرگس سیٹھی ہمارے گروپ کی روح رواں تھیں۔ کراچی کی رہنے والی تھیں۔ ہر وقت اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ حس مزاح بھی خاصی تیز تھی۔ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ جب بھی کلاس سے کھسکنا ہوتا تو سب سے پہلے وہ دبے قدموں باہر نکلتی۔

ہم نے کراچی میں چند مصروف دن گزارے۔ سٹاک ایکسچینج، سٹیٹ بنک، ہاربر اور ٹی وی اسٹیشن دیکھا۔ ہر محکمے نے اپنے فرائض بتائے اور کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ سٹاک ایکسچینج کا نظام خاصا گنجلک تھا۔ اسے Refined Gambling بھی کہا جا سکتا ہے۔ دنوں میں شاہ گدا بن جاتے ہیں۔ مرسیڈیز گاڑیوں میں سفر کرنے والے سائیکل رکشہ چلاتے نظر آتے ہیں۔ عالی شان بنگلوں میں رہنے والے

قلیوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ حرص اور ہوس زر انہیں لے ڈوبتی ہے۔ راتوں رات امیر بننے کا جنون انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کچھ لوگ پیسہ بناتے بھی ہیں لیکن قسمت کے ایسے دھنی بہت کم ہوتے ہیں۔ زیادہ مال وہ لوگ بناتے ہیں جن کے پاس پہلے ہی بہت کچھ ہوتا ہے۔ جس طرح نیویارک میں راک فیلر، فورڈ اور گیٹس گٹھ جوڑ کرتے ہیں اسی طرح ہمارے ہاں بھی داؤد حبیب اور سہگل ملی بھگت سے سٹاک مارکیٹ کو گراتے، اُٹھاتے رہتے ہیں۔ یہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ جب لالچ اور Thrill یکجا ہو جائیں تو عقل جواب دے جاتی ہے۔ وہاں جا کر پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ملک کی ساری دولت تو ایک شہر میں ہے اور اس شہر کے بھی صرف چند ہاتھوں میں، باقی سب شور و شین ہی ہے۔ ٹیلی ویژن سٹیشن پر کوئی نئی بات نہ تھی۔ البتہ کئی شوخ و شنگ چہرے نظر آئے۔ بڑی سکرین تک پہنچنے کے لیے چھوٹی سکرین کے راستے سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہم نے اکثر اینکر پرسن اور اداکاروں کو لمبے لمبے ڈائلاگ بولتے دیکھا تھا۔ فرفر اُردو اور انگریزی میں بات کرتے ہوئے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے۔ ہم ایک عرصہ تک ان کے حافظے کی داد دیتے رہے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ سب ٹیکنالوجی کا کمال ہے۔ ناظرین کی نظروں سے ہٹ کر ایک پٹی چلائی جاتی ہے۔ وہ صرف تحریر پڑھ رہے ہوتے ہیں حافظے پر زور نہیں ڈالنا پڑتا۔ پی ٹی وی سے وابستہ ایک کمرشل کمپنی نے ڈیفنس کلب میں لنچ کا انتظام کر رکھا تھا۔ لنچ کا لطف دوبالا ہو گیا کیونکہ چند چوٹی کی اداکارائیں بھی مدعو تھیں۔ بٹ صاحب کافی دیر تک ان کی کلاس لیتے رہے، حسب ضرورت چند شعر بھی ان کی نذر کیے۔ رخصتی کے وقت ٹیلی فون نمبر لینا نہ بھولے۔

میاں غفار نے کہا "پرسوں تو ہم سب نے واپس چلا جانا ہے تم ان نمبروں کا اچار ڈالو گے؟"

رفیق بٹ مسکرایا "اپنا کام عرضی ڈالنا ہے، سو ڈال دی ہے۔ تم نے شاید نوٹ نہیں کیا، میں نے سب کو چپکے سے اپنا وزٹنگ کارڈ تھما دیا ہے۔ کیا خبر کل کلاں کوئی لاہور آ جائے

This world has become a global village

"بٹ کی **Modus Operandi** درست ہے۔" رئیس عباس بولا۔

"خوبصورت کشمیری لڑکا ہے پھر پولیس میں ہے گویا کریلا نیم چڑھ گیا ہے۔ یہ کام بہت صبر آزما ہوتے ہیں۔"

سب سے زیادہ دلچسپ ملاقات آئی جی سندھ سے تھی۔ رانا مقبول صاحب خیر سے آئی جی تھے۔ رانا صاحب نیپا میں ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن رہ چکے تھے اس لئے شاہد مجید سے گاڑھی چھنتی تھی۔ رانا صاحب نے کراچی پولیس کی ورکنگ پر لیکچر دینا تھا۔ مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ یہ شخص قسمت کا دھنی تھا، جادوگر تھا یا کوئی بہت بڑا زمانہ ساز جسے حکمرانوں کو شیشے میں اُتارنے کا فن آتا تھا۔ سانحہ میں نو آدمیوں

کے قتل کے بعد فوری طور پر پروموٹ ہوا۔ اپنی کوتاہی کو ڈی آئی جی ٹریفک کے سر پر ڈال کر اسے معطل کرا دیا۔ میاں نواز شریف برطرف ہوا تو فوراً نہ صرف وٹو کی گود میں جا بیٹھا بلکہ رانا پھول کے لڑکوں کو حکومت میں شمولیت کے فوائد اور بصورت عدم تعاون نقصانات تک گنوا ڈالے۔ وہی شخص اپنے سینئرز کو روندتا، رگیدتا اور ان کے کاندھوں سے پھسلتا ہوا انسپکٹر جنرل پولیس سندھ بن بیٹھا تھا۔ ہمایوں بادشاہ نے تو صرف ایک نظام سقے کو نوازا تھا۔

رانا صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ شاہد مجید کو گرینڈ پا کہہ کر چھیڑ ڈال لیا اور پھر ایک بڑی پر مغز تقریر کی۔ میں ان کا شعری ذوق دیکھ کر حیران رہ گیا۔ غالب و میر، داغ اور ذوق کے اس قدر عمدہ برمحل اشعار، اُن کا حکیمانہ استعمال، پڑھنے کا منفرد انداز، کم از کم ایک پولیس افسر سے توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ ہر شعر پڑھنے سے پہلے میری طرف دیکھ کر معذرت کرتے۔ کہتے "شاہ صاحب کے سامنے شعر پڑھنے کی جسارت کرنا بڑا مشکل کام ہے لیکن میں معذرت اور ان کی پیشگی اجازت سے یہ شعر پڑھ رہا ہوں۔"

اشعار کے علاوہ بھی ان کی تقریر میں بہت کچھ تھا۔ ڈیڑھ کروڑ لوگوں کے شہر کی پولیسنگ کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایک ایسا شہر جہاں بے ہنگم ٹریفک تھی، منشیات کے جگہ جگہ اڈے تھے، زیر زمین ڈانوں کی عملداری تھی - لسانیت، علاقائیت اور فرقہ واریت کے مسائل تھے، سیاست دانوں کی چپقلش تھی۔ پھر اُوپر سے آئے ہوئے احکامات کی تعمیل تھی۔ غالباً کسی ایسے ہی حکم کی تعمیل میں آصف علی زرداری کی زباں درازی کم کرنے کا منصوبہ بنا تھا۔ عجب اتفاقات ہیں زمانے کے۔ تعمیل کنندہ روپوش ہے۔[1] دربدر خاک چھان رہا ہے۔ ایک طویل عرصہ تک مشرف دور میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ تلوار ٹیڑھی ہو گئی ہے، گھس پٹ کر زنگ آلود ہو گئی ہے لیکن اس کو چلانے والے ہاتھ سلامت ہیں۔ فضا میں بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کے نعرے گونج رہے ہیں۔ صوبائی سطح پر ہی سہی باہم حکومت سازی ہو رہی ہے۔

"کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں"

ا- اب واپس آ گیا ہے۔

رانا صاحب نے بھی لنچ کا بندوبست کیا تھا۔ پولیس والوں کا کھانا مزیدار ہوتا ہے۔ ایک تو ڈشیں بے شمار ہوتی ہیں کیونکہ ہر ہوٹل، ہر تکہ شاپ اور بار بی کیوان کی عملداری میں ہوتا ہے پھر یہ سوچ کہ آج پولیس مہمان نہیں بلکہ میزبان ہے، بذات خود بڑی خوش کن ہوتی ہے۔

علی الصبح ہمارا جہاز گوادر کے لئے روانہ ہوا۔ یہ نیم ڈومیسٹک اور نیم بین الاقوامی فلائیٹ تھی۔ جہاز نے مسقط جانا تھا۔ گوادر پہلا پڑاؤ تھا۔ فوکر کی جگہ بوئنگ نے لے لی تھی۔ مجھے ایک پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ محکمانہ امتحان دے کر میں اور ملک غلام مصطفیٰ براستہ گوادر مکران جا رہے تھے۔ ایک گھنٹے کی طویل فلائیٹ کے بعد اعلان ہوا کہ موسم

خراب ہے۔ جہاز لینڈ نہیں کر سکتا اس لئے واپس کراچی جا رہے ہیں۔ کراچی پہنچے تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک لحیم شحیم اونچے قد والا شخص کاؤنٹر پر زور زور سے مکے مار رہا تھا۔ وہ ایئر لائین کے عملے پر گھن گرج کے ساتھ برس رہا تھا۔ You have wasted my time. I will sue you in the court of law. میرا لاکھوں روپے کا نقصان ہو گیا ہے۔ کارخانہ بند پڑا ہے اگر انجینئر نہ پہنچے تو بہت نقصان ہو گا۔ ملک زرمبادلہ نہیں کما سکے گا۔" پتہ نہیں ایسے مواقع پر لوگوں کا جذبہ حب الوطنی کیسے جاگ جاتا ہے۔ یہ عیسیٰ جعفر تھا ملک کا کارخانہ دار۔ اس کا گوادر میں پرانز اور مچھلی کو فریز کرنے اور انہیں برآمد کرنے کا کارخانہ تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کی لانچیں روزانہ میٹھا پانی اور Raw Material لے کر کراچی سے گوادر جاتی تھیں۔ تمام سرکاری ملازمین اس کا دیا ہوا پانی پیتے تھے۔ ایک ٹین یومیہ، دو ٹین تین عدد حصہ بقدر جثہ۔ عہدے کی اہمیت کے لحاظ سے پانی تقسیم ہوتا۔ اتنے اہم شخص کو پی آئی اے نے ناراض کر دیا تھا۔ چار گھنٹوں تک وہ گرجتا برستا رہا اس تمام عرصے میں عملہ بھیگی بلی بنا مغلظات سنتا رہا۔ آخر اعلان ہوا کہ جہاز تیار ہے۔ گوادر میں موسم صاف ہو گیا تو سب کی جان میں جان آئی۔ جب جہاز نے گوادر میں لینڈ کیا تو باہر نکل کر خاصی مایوسی ہوئی۔ ان بیس سالوں میں کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ سندباد جہازی بھی ہنوز وہاں تک نہ پہنچ پایا تھا۔ حسینائیں بھی آبنوسی رنگ کی تھیں۔ وہی نیم پختہ بازار وہی کچے پکے مکانات۔ اے سی ہاؤس اب بھی سمندر کے کنارے اپنی عمر طبعی کے بقیہ ایام گزار رہا تھا۔ بندرگاہ قدرے کشادہ ہو گئی تھی۔ اس وقت تک لوگ ایک روشن مستقبل کے جھانسے میں نہ آئے تھے۔

کراچی کو گوادر سے ملانے والا فیشنل ہائی وے بھی نہ بنا تھا صرف دو تبدیلیاں نمایاں تھیں۔ تحصیل کو ضلعے کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اے سی کی جگہ ڈی سی بہادر نے لے لی تھی۔ بندرگاہ کے قریب قصبے کے مضافات میں بھربھری پہاڑی پر ایک کالونی کی اسکیم بن گئی تھی۔ پہاڑی قریباً بیٹھ گئی تھی۔ ماہرین کا خیال تھا کہ مکان بنے تو مزید سرک جائے گی۔ پہاڑی پر کھڑے ہو کر سمندر کا منظر البتہ دیدنی تھا۔ اس اعتبار سے یہ گوادر کا سب سے خوبصورت Spot تھا۔ سامنے حد نگاہ تک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر پہاڑ کے بالکل نیچے بندرگاہ، بائیں جانب گوادر کا تاریخی قصبہ اور اس سے چند میل کے فاصلے پر اہرام مصر کی طرح سمندر میں سے اُبھرتی ہوئی پہاڑیاں۔ ڈرائیور نے بتایا کہ پچھلی جنگ میں پاکستانیوں نے اپنے جہاز ان کے درمیان چھپا دیے تھے۔

ڈپٹی کمشنر سے ملاقات ہوئی۔ اُسے جب بتایا کہ کسی زمانے میں ہم بھی ان ریگزاروں میں سر پٹختے رہے ہیں تو بہت خوش ہوا۔ اس نے گوادر کی تاریخ، جغرافیائی اہمیت اور معیشت پر ایک طویل لیکچر دیا۔ چونکہ سب باتیں پہلے بیان ہو چکی ہیں اس لئے اُن کا اعادہ تضیع

اوقات ہوگا۔ سب افسران نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اُن انکشافات کو سنا۔ مکران ضلع کو تین ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پنجگور، تربت اور گوادر۔ گوادر سے آگے جیوانی ہے۔ وہ بھی بندرگاہ ہے لیکن اس کی خاص اہمیت نہیں ہے البتہ اسے سمگلروں کی جنت کہا جاتا ہے۔ جو لوگ غیر قانونی طور پر خلیجی ریاستوں میں جاتے ہیں وہ بھی جیونی سے لانچوں میں بیٹھتے ہیں۔ پاکستان میں سونا بھی اسی راستے سے آتا تھا، اسی طرح منشیات باہر بھیجنے کا بھی وہ سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ ڈی سی کے لیکچر اور لنچ کے درمیان سب نے بازار گھوم پھر کر دیکھا۔ لاہور کراچی کی نسبت کچھ چیزیں کافی سستی تھیں۔ بوسکی، جاپانی کپڑے، سگریٹ اور وسکی۔ سوائے وسکی کے سب نے کپڑے اور سگریٹ خریدے۔ آخر گھر رکھاؤ بھی تو کوئی چیز ہے۔

لنچ کا بندوبست سول ریسٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس سمندر کے کنارے پر ہے۔ اسے ایک اعتبار سے Beach بھی کہا جا سکتا ہے۔ عمارت اور فرنیچر دیکھ کر یک گونہ مسرت ہوئی۔ دُور دراز علاقے میں اس قدر اہتمام کر لینا بھی بڑی بات تھی۔ ڈی سی انتظامی امور کا ماہر ہوتا ہے۔ اسے علم تھا کہ ہم نے کون سی چیز رغبت سے کھانی ہے۔ تکی کے علاوہ سی فوڈ کی بہتات تھی۔ پرانز ہر قسم اور سائز کے حتیٰ کہ بریانی بھی پرانز بریانی تھی۔ مچھلی کی کئی قسمیں تھیں۔ سب نے رات کا کھانا بھی احتیاطاً دن کو ہی کھا لیا۔ اتنا مزیدار کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کو بہت جی چاہا لیکن شاہد مجید نے پروفیسر تھیو کی طرح اس کی مہلت نہ دی۔ بولا "ہری اپ! اقطر سے جہاز واپس آ گیا ہے اور کسی وقت بھی لینڈ کر سکتا ہے۔"

گوادر کو دوبارہ دیکھ کر چنداں حیرانی نہ ہوئی۔ حیرت البتہ اس پروپیگنڈہ پر ہوتی ہے جو ترقی کے نام پر آج کل کیا جا رہا ہے۔ پرویز مشرف حکومت نے گوادر میں چھوٹی سی بندرگاہ کیا بنا ڈالی ایک تسلسل کے ساتھ وقتی طور پر ہی سہی کچھ ایسا موثر پراپیگنڈہ کیا کہ اہل وطن نے سمجھا سونے کی کان کھد گئی ہے۔ اس پراپیگنڈے کی آڑ میں حکومت کے حواریوں، درباریوں، مداریوں نے اربوں کمائے۔ کمپیوٹر کی مدد سے کھڑے کیے گئے سکائی اسکریپر دکھائے گئے۔ پلاٹوں کی لوٹ سیل شروع ہوئی۔ کچھ اس قسم کا تاثر دیا گیا کہ کسی جادو کی چھڑی یا الہ دین کا چراغ رگڑنے سے راتوں رات ایک ایسا شہر بس جائے گا جو دبئی، سنگا پور، ہانگ کانگ کو مات کر دے گا۔ ایک تو تلے کرکٹر کی خدمات حاصل کر کے سبزی اور فروٹ منڈیاں دکھائی گئیں۔ کمرشل پلاٹ بکے۔ کسی کو نہ سوجھی کہ اس ریگزار میں پانی کہاں سے آئے گا۔ جہاں لوگ العطش العطش کرتے ہیں وہاں سبزہ زار کیونکر کھل سکیں گے۔ اگر دفاعی نقطہ نظر سے دیکھیں تو وہاں پر نیول بیس ضرور بن سکتا ہے لیکن نیول بیس کے لیے نیوی بھی تو ہونی چاہئے۔ ہندوستان کے

پاس ایئر کرافٹ کیریئر تک ہیں، ہمارے پاس کیا ہے۔ اگر مقصد اسے کسی سوپر پاور کے حوالے کرنا ہے تو وہ قومی مفاد میں نہیں۔ ایک کوسٹل ہائی وے بھی بنا دی گئی ہے۔ تین سو میل لمبی سڑک جسے Maintain کرنا کار دارد ہے۔ ہر بارش کے بعد رود کوہیاں اسے اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیتی ہیں۔ مرمت کا کام خاصا مہنگا اور محنت طلب ہے۔ گوادر میں اُترے ہوئے مال کی قیمت اور کراچی بن قاسم کی قیمت میں نمایاں فرق ہے۔ تین سو میل کے طویل پہاڑی راستوں سے آیا ہوا سامان بہت مہنگا پڑتا ہے۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ بلوچ لیڈر بلاوجہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کی شہہ پر دہشت گرد کھل کھیل رہے ہیں۔ قافلوں پر حملے ہوتے ہیں، ٹارگٹ کلنگ جاری ہے۔ ان معروضی حالات میں کون وہاں بزنس کرنے جائے گا۔ بلوچ لیڈروں بالخصوص عطاء اللہ مینگل کا استدلال ہے کہ اس طرح آبادی کا Complexion بدلا جا رہا ہے۔ ایک دن غیر بلوچ بلوچوں کی نسبت زیادہ تعداد میں بس جائیں گے پھر کوئی پنجابی مخدوم یا سندھی وڈیرہ وہاں سے الیکشن لڑے گا اور پیسے کے زور پر جیت جائے گا۔ یہ اہل نظر لوگ ہیں لیکن انہیں اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی ہے۔ ایک دن جنرل حسین مہدی گوادر کی کچھ ضرورت سے زیادہ تعریف کر گئے تو عرض کیا "جو آپ نے سوچا ہے یا جس کے سہانے سپنے لوگوں کو دکھائے جا رہے ہیں وہ ممکن نہیں ہے۔" انہوں نے کچھ ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہے یا پھر میں نے کوئی بھونڈا مذاق کیا ہے۔ جب بحث شروع ہوئی تو انہیں احساس ہوا کہ میری ہر دلیل کے ساتھ تاریخ اور جغرافیہ ہم قدم ہو کر چل رہے ہیں۔ ویسے تو اس بدقسمت قوم کے ساتھ ہر حکمران نے مذاق کیا ہے لیکن پرویز مشرف اس اعتبار سے بازی لے گیا ہے کہ وہ برصغیر کا دوسرا محمد تغلق تھا۔ جس قسم کا بلدیاتی نظام وہ لایا اور جس بے ہنگم طریقے سے اُس نے پولیس کی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کی اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ لوگ آج بھی فرانس کی ملکہ میری اینٹینویٹ کا لطیفہ چسکے لے کر سناتے ہیں جس کی رو سے اس نے بھوکی جنتا کو کیک پیسٹریاں کھانے کا مشورہ دیا تھا۔ اُسے کسی پولیس افسر نے بتایا کہ تھانیدار اس لئے کرپشن کرتا ہے کہ مجسٹریٹ اس کے خلاف ایکشن نہیں لیتا۔ اس پر بھولے شاہ نے کسی دوست سے پوچھا کہ آخر مجسٹریٹ تھانیدار کو رشوت لینے سے روکتا کیوں نہیں ہے۔ نتیجتاً ایسا پولیس ایکٹ لایا گیا جس کی رو سے ایس ایچ او تو مکمل طور پر آزاد ہو گیا لیکن جوڈیشل اختیارات واپس لے کر مجسٹریسی کے پر کاٹ دیے گئے۔

[جاری ہے۔]

غزل

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

اس خرابے کی طرف وہ کارواں کب آئے گا
ہجر کے اندھے کنویں سے کب نکل پائیں گے ہم

زندگی کے ہاتھ میں تو ہاتھ دے دیں گے، مگر
وحشتوں کے پاؤں میں کیا خاک پہنائیں گے ہم

دوریوں کی آگ بھی ہم کو جلا دے گی، مگر
قربتوں کی آگ میں بھی راکھ ہو جائیں گے

عمر بھر اک زخم کی ہم پردہ داری کر تھکے
آج کی شب کانچ کی دیوار ہو جائیں گے ہم؟

بول کیا روحوں سے ناتے توڑ سکتے ہیں بدن؟
سوچ، اے جانِ حیا! کیا تجھ سے کترائیں گے ہم؟

گمرہی! تجھ کو ہماری پارسائی کی قسم
دیکھ لینا! ایک دن جی بھر کے پچھتائیں گے ہم

اے بتِ زیبا! تری ضربِ تغافل کی قسم
کرچی کرچی تیرے، قدموں میں بکھر جائیں گے ہم

خالد احمد

غزل

دل پر پڑا تھا بوجھ وہ بھاری نہیں جناب
پایا جو زخم ایسا بھی کاری نہیں جناب

باقی رہے لحاظ نگاہوں میں آپ کی
دستار میں نے سر سے اُتاری نہیں جناب

ہے اور بات دل میں مرے احترام تھا
بازی تو میں نے آپ سے ہاری نہیں جناب

پیدل ہی آ گیا ہوں زمانے کو چھوڑ کر
میرے لیے تو کوئی سواری نہیں جناب

اب سامنے کی بات ہے تقسیم کیا کریں
ہر چیز آپ کی ہے، ہماری نہیں جناب

ثاقب نہ مجھ سے آپ کبھی خوش گمان ہوں
میری کسی بھی شخص سے یاری نہیں جناب

آصف ثاقب

غزل

کس آن زندگی کا تماشا ہوا تمام
ہونے لگے تھے محو کہ قصہ ہوا تمام

منظر ذرا ٹھہرنے لگے تھے نگاہ میں
منزل کھڑی تھی سامنے رستہ ہوا تمام

پل میں قضا نے کر دیا خیطِ انا فنا
عمروں کی 'تیر میر' کا جھگڑا ہوا تمام

مہلت حیات کی ہوئی پوری تو یہ کھلا
کارِ حیات ابھی نہیں آدھا ہوا تمام

ڈالا گیا بنا کے پھر اِس میں ذرا سا جھول
تب جا کے کائنات کا نقشہ ہوا تمام

رکتا وہ کیا نگاہ بچا کر گزر گیا
سامانِ شوق رہ گیا رکھا ہوا تمام

عالی کبھی کبھی تو لگے ہے یہ چار سُو
پہلے بھی ہو بہو کہیں دیکھا ہوا تمام

جلیل عالی

غزل

میں نے اس کی آنکھوں میں روشنی سی دیکھی ہے
رات کی سیاہی میں چاندنی سی دیکھی ہے

دِل میں جتنے غم پالے اس کی نذر کر ڈالے
پھر بھی اس کے چہرے پر بے رُخی سی دیکھی ہے

آسماں سے کیا شِکوہ کارواں کے لُٹنے کا
دشت کے لبوں پر بھی خامشی سی دیکھی ہے

واقعہ نہ ہو سرزد اس کو بُھول جانے کا
دَرد میں بھی اَب ہم نے اِک کمی سی دیکھی ہے

دردِ دل کا حاصل کیا، اِک طویل بے خوابی
آگہی کے پردے میں بے خودی سی دیکھی ہے

تُم سے کیا ہُوا ساجد بے خودی کے عالم میں
غم کی پاسداری میں برہمی سی دیکھی ہے

سید افسر ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہر بھی صحرا ٹھہرا خالد
پگ پگ ڈاریں کستوری کی

غزل

مزاجِ موجۂ غم جانتا ہوں اندر سے
چھلک پڑا ہوں کہ میں بھر چکا ہوں اندر سے

بہت سا زنگ لگایا گیا مرے ہر سُو
اور اب یہ حال کہ میں آئنہ ہوں اندر سے

ہوائے شام اُڑا لے گئی چراغ کی لَو
اور اس کے بعد میں خود جل اُٹھا ہوں اندر سے

کسی کی پلکیں مجھے مجتمع نہیں کرتیں
میں ایک خواب سا بکھرا پڑا ہوں اندر سے

پرندے چھوڑ کے جاتے نہیں بدن میرا
کہ زرد رُت میں بھی شاید ہرا ہوں اندر سے

کبھی کبھی کوئی بارش سی مجھ میں ہوتی ہے
کبھی کبھی میں بہت بھیگتا ہوں اندر سے

بُلا رہا ہے اُفق پار سے کوئی اطہر
سو اِن دنوں میں سفر کر رہا ہوں اندر سے

ممتاز اطہر

غزل

اپنے پیروں سے کسی بستی کا جادہ باندھ کر
چل رہے ہیں ایک مدت سے ارادہ باندھ کر

میرے سر پر میری اپنی زندگی کی دوڑ نے
رکھ دیا ساماں ضرورت سے زیادہ باندھ کر

اس قیامت کی گھڑی میں چپ ہیں میخانہ بدوش
خشک ہونٹوں پر خیالِ ترکِ بادہ باندھ کر

یوں تو ازبر ہیں کتابِ دل تری سب آیتیں
بھول جاتا ہوں سبیلِ استفادہ باندھ کر

اپنا کیا ہے ہم اسیرانِ ہوس کے ہیں غلام
چل پڑیں گے پھر ارادوں پر اعادہ باندھ کر

ہجرتوں سے کیا ملا اندھی مسافت کے سوا
در بدر ہیں پیٹ پر پتھر زیادہ باندھ کر

کس قدر مشکل ہے خود کو ہر کسی پر کھولنا
اور بھی مشکل کیا مضمون سادہ باندھ کر

اتنے روشن راستوں پر مجھ کو اندھا کر دیا
میری آنکھوں پر شکوہِ خانوادہ باندھ کر

لوگ تو چہرے سے اندازہ لگا لیں گے کنور
کیا چھپا لو گے بھلا تن پر لبادہ باندھ کر

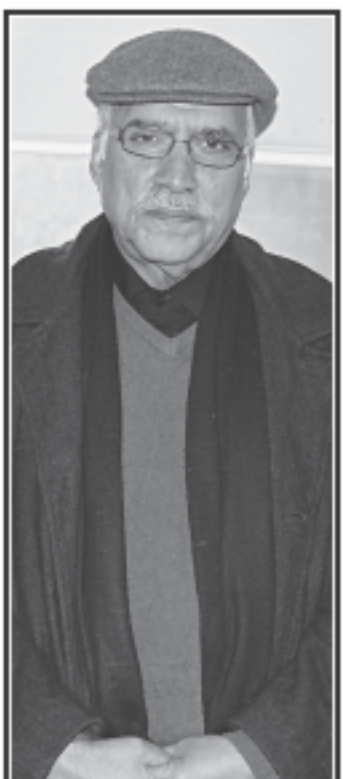

اعجاز کنور راجہ

غزل

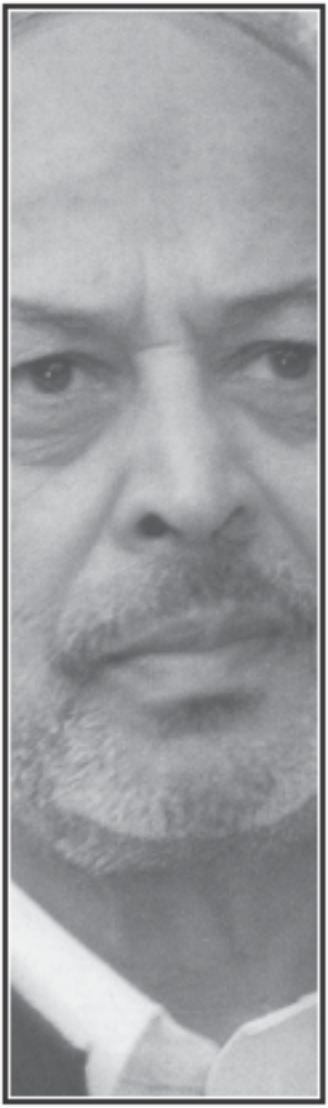

خواہشِ مرگِ تمنا دلِ بیمار کے بیچ
راحتِ وصل کہاں ہجر کے آزار کے بیچ

دیکھتے رہنے کے باوصف نہ دیکھا اس کو
آنکھ کی پتلی بھی حائل رہی دیدار کے بیچ

نقدِ جاں دے کے اسے اپنا بنایا لیکن
جان ہی پردہ بنی میرے، خریدار کے بیچ

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں میخانے میں
در بنانے کی تمنا نہیں دیوار کے بیچ

عقل اور عشق میں تکرار سے حاصل کیا ہے
ناسمجھ ہو گا وہی آئے جو تکرار کے بیچ

ایک سے ایک حسیں ہم نے جہاں میں دیکھا
قدرِ توفیقِ ہنر دیکھی ہے کردار کے بیچ

حرفِ حق کہنے کا انجام ہے معلوم کہ ہم
پا بہ زنجیر نظر آئیں گے بازار کے بیچ

یاد کرتا ہوں اسے آج بھی رہ رہ کے حسن
سانحہ ایسا بھی اک آیا ہے اَدوار کے بیچ

حسن عسکری کاظمی

غزل

مضمحل ہونے کی تہمت سے کنارہ کرتے
لوگ اثبات قدم کا کوئی چارہ کرتے

بے طرح جیت میں ہے جی کا خسارہ یکسر
جیت بھی جاتے اگر ڈھنگ سے ہارا کرتے

بات کیوں بڑھتی اگر بات نہ بڑھنے دیتے
ضبط کی حد میں جو رہتے تو گزارا کرتے

راستے اور قریب سر منزل ہوتے
بوجھ اوروں کے جو ہم دوش اتارا کرتے

آنکھ سے حسن طرح دار کا ظاہر نہ گیا
لطف آجاتا اگر دل سے نظارہ کرتے

وہ جو منہ موڑ کے جانے کے روادار ہوئے
غیر ممکن تھا کہ جانے کا اشارہ کرتے

منظر خوب سے سج جاتا ریاض ہستی
ہو کے بے لوث جو ہم اس کو سنوارا کرتے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

دیکھیں جو عہدِ رفتہ کی بارہ دری سے ہم
شاداب ہونے لگتے ہیں خوش منظری سے ہم!

خائف تو رہنا تھا، سو رہے تیرگی سے ہم
لیکن یہ کیا کہ ڈرتے رہے روشنی سے ہم!

لوٹے جو بزمِ ناز میں ہم مدّتوں کے بعد
"کچھ اجنبی سے لوگ تھے، کچھ اجنبی سے ہم"

تجھ چارہ گر کے پاس کہاں ہے کوئی علاج؟
بیمار ہو گئے تری چارہ گری سے ہم

رُکتا نہیں ہے شعر کی آمد کا سلسلہ
کہتے نہیں غزل کبھی کاری گری سے ہم

کیا خوب اپنی ذات کی پیچیدگی سے ہیں!
منسوب، زلفِ یار کی پیچیدگی سے ہم

ہم مطمئن نہ دن میں رہے اور نہ رات میں
کچھ تیرگی سے تنگ تھے کچھ روشنی سے ہم

غالبؔ صدی منائی گئی تھی، یہ سوچ کر
ناراض ہو رہے ہیں اب اپنی صدی سے ہم

ہر کام زندگی میں کیا انہماک سے
شاکی نہیں ہیں زیست کی کم فُرصتی سے ہم

اُس نے اُسے بھی لہجے سے آلودہ کر دیا
زاہد سے کہہ رہے تھے جو شائستگی سے ہم

پت جھڑ کا کوئی رنگ ہمیں چھو نہیں سکا
رہتے ہیں تازہ دم یوں سدا شاعری سے ہم

یہ انفرادیت بھی اِک اعزاز ہے نسیمؔ
اپنی شناخت رکھتے ہیں بے چہرگی سے ہم

ساحرؔ (لدھیانوی) کی طرح ہم نہ کہیں گے کبھی نسیم
"تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم"

نسیمِ سحر

غزلیں

طلسمِ شب کا ستم ہے سحر ہے بے معنی
نظر پرائی ہے خوابوں کا در ہے بے معنی

وہاں یقیں سے کوئی کارواں چلے کیسے
قدم قدم پہ جہاں ہر ڈگر ہے بے معنی

بتا میں ایسی نظر کو قبول کیسے کروں
وہ جس نظر میں متاعِ ہنر ہے بے معنی

پڑا ہے وقت یہ کیسا فضائے گلشن پر
اداس چھاؤں ہے شاخِ ثمر ہے بے معنی

اِک ایسا خواب ہے تعبیر ہی نہیں جس کی
اک ایسی آنکھ ہے جس کا سفر ہے بے معنی

ہمارے عہد میں یہ کیسا عذاب اترا ہے
کہ لفظ لفظ ہے جھوٹا اثر ہے بے معنی

ڈرائے کیا اُسے باہر سے رسمِ چنگیزی
کہ جس کے واسطے اندر کا ڈر ہے بے معنی

نثار ترابی

چاند اور کہکشاں ہے خوابیدہ
رات! تیرا جہاں ہے خوابیدہ

چیز کوئی نہیں ہے برجستہ
یہ زمیں آسماں ہے خوابیدہ

منزلوں کا سراغ ہے دھندلا
راستوں کا نشاں ہے خوابیدہ

جس طرف ڈھول ہے مسافت کی
اُس طرف کارواں ہے خوابیدہ

ہر جبیں کا ہے آستاں قائم
ہر مکیں کا مکاں ہے خوابیدہ

دنیا داری کی کیا حقیقت ہے
اِس کا سُود و زیاں ہے خوابیدہ

کس بھروسے پہ چل پڑے کوئی
جب یقیں ہو گماں ہے خوابیدہ

غزلیں

تاج کو چومتے ، دربار سجاتے ہُوئے لوگ
کل کو پچھتائیں گے یہ جشن مناتے ہُوئے لوگ

رہ گئی آنکھ میں بے رنگ حقیقت کی شبیہہ
سو گئے رنگ بھرے خواب دِکھاتے ہُوئے لوگ

دل کو ہر آن ہی بے چین کیے رکھتے ہیں
کبھی اِس شہر میں آتے کبھی جاتے ہُوئے لوگ

چلے جاتے ہیں کسی منزلِ گم گشتہ کو
ٹھوکریں کھاتے ہُوئے، خاک اُڑاتے ہُوئے لوگ

بھُول بیٹھے ہیں یہ آدابِ شہادت خاور
سر جھکائے ہُوئے دستار بچاتے ہُوئے لوگ

خاور اعجاز

اَب کھڑے ہیں نمِ دامن کو چھپائے ہُوئے لوگ
کل تلک مفت کی بارش میں نہائے ہُوئے لوگ

نکل آئیں گے فقط ایک صدا پر اُس کی
سینکڑوں سال سے مٹی میں سمائے ہُوئے لوگ

مجھے لگتا ہے کہ اپنوں سے جدا کر دیں گے
میرے نزدیک جو ہیں دُور سے آئے ہُوئے لوگ

آسماں سر پہ نہ ہوتا تو کدھر کو جاتے
خُود سے رُوٹھے ہُوئے، دُنیا کے ستائے ہُوئے لوگ

اُس کی آغوش میں ہی ہم کو بٹھا دے گی اجل
ہم ہیں جس خاک کے پہلو سے اُٹھائے ہُوئے لوگ

غزل

گئے دنوں کے سراغ روشن کیے گئے ہیں
جو بجھ گئے تھے چراغ روشن کیے گئے ہیں

دوا سمجھ کے ذرا سی پینے میں حرج کیا ہے
ذرا سی پی کر دماغ روشن کیے گئے ہیں

جمالِ ساقی سے میکدے میں جگہ جگہ پر
محبتوں کے ایاغ روشن کیے گئے ہیں

تمہارے چہرے پہ تل سجایا گیا ہے جاناں
ہمارے سینے میں داغ روشن کیے گئے ہیں

مری زمیں پر کسی بھی شے کی کمی نہیں ہے
یہاں بھی جنت کے باغ روشن کیے گئے ہیں

یہ کہکشاں بھی کسی مسافر کی رہ گزر ہے
تبھی تو اتنے چراغ روشن کیے گئے ہیں

تمہاری یادوں کی سرد راتیں گزارنے کو
شرارِ دل سے اجاغ روشن کیے گئے ہیں

جو صرف میرے تھے اور میرے لیے تھے باقی
وہ لمحہ ہائے فراغ روشن کیے گئے ہیں

باقی احمد پوری

غزل

دل کی لرزش بدن پہ بھی دھر لیں
کوئی کھٹکا ہوا ہے ، ہم ڈر لیں

دیکھ کر اچھی سی بتایئے گا
جیل بہتی کوئی ، جہاں گھر لیں

اپنے اپنے عذاب تو جی لیں
اپنے اپنے نصیب تو مَر لیں

عشق کی شاعری بھی کر لیں گے
پہلے دھرتی کے بَین تو کر لیں

پھر بھی کیا جھوٹ ہی اُٹھاؤ گے
حلف گر ہم تمھارے سر پر لیں

جب بھی دل چاہے آپ کا بے شک
ملک کے نام پر ہمیں دھر لیں

آپ کو کربلا سے عادت ہے
اِس دفعہ آئیں نا مرا سر لیں

ہم کسی فیصلے میں ہیں ہی نہیں
کیونکر الزام بے وجہ سر لیں

مجھ کو خدشات سے بچا لیجیے
اِس سے پہلے کہ یہ مرا سر لیں

آنکھ بچتی نظر نہیں آتی
ریت بھر لیں یا راستے بھر لیں

طرزِ تعمیر میں یہ ہے ہی نہیں
کوئی کھڑکی گھٹن سے باہر لیں

اک گروہی فساد ہے دنیا
جس طرح چاہیں تجزیہ کر لیں

بہترین آپشن اگر نہیں ہے
یہی بہتر ہے کوئی بہتر لیں

گر ہمیں انتخاب کرنا ہو
ہم تو سب چھوڑ دیدۂ تَر لیں

فرحت عباس شاہ

غزل

دیکھتا تھا مگر نہیں دیکھا
ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھا

تیرے کوچے سے جب نکل آئے
پھر پلٹ کر اِدھر نہیں دیکھا

ایسے لپٹی ہے پاؤں سے ہجرت
ایک مدت سے گھر نہیں دیکھا

میرے چھالوں کو دیکھنے والے
تُو نے میرا سفر نہیں دیکھا

اس نے امکان کے دریچے سے
آج بھی جھانک کر نہیں دیکھا

پھر کسی کام کی نہیں آنکھیں
تم نے اس کو اگر نہیں دیکھا

راہِ دشتِ جنوں کے راہی نے
پاؤں دیکھے ہیں سر نہیں دیکھا

تیرے دستِ عطا کی بخشش نے
با ہنر ، بے ہنر نہیں دیکھا

ایسی برسات کی ہے جلووں کی
دامنِ دیدہ ور نہیں دیکھا

خواب میں ایک بار دیکھا تھا
پھر تجھے عمر بھر نہیں دیکھا

افتخار شاہد

غزل

کُھل کے اظہارِ ندامت، جو گُنہ گار کرے
اُس پہ کیوں سایۂ رحمت نہ وہ غفار کرے

سوچ کر کہیے کہ اس شخص کا دیں کیا ہو گا
جس کی تعریف ہر اک کافر و دیں دار کرے

اپنا موقف وہ بتائے، مگر اِس سے پہلے
جو عقائد ہیں غلط، اُن کا تو انکار کرے

معترض! سوچ! جو ہو سُرخ بخاریؒ کا پسر
کیوں نہ وردِ سبقِ عظمتِ کردار کرے

جب ہے ہر شے سے عیاں، تیرا کمالِ تخلیق
کیوں نہ ہر دیدۂ بینا، ترا دیدار کرے

کام ہو جاتا ہے احساں کے جو ہتھیاروں سے
نہیں ممکن، کوئی خنجر، کوئی تلوار کرے

عصرِ حاضر کی ضرورت ہے جلال اب وہ کلام
جاں کو گرمائے جو، اور قلب کو بیدار کرے

سید قاسم جلال

غزل

سنگ باری کا سزاوار نہ سمجھا جائے
کیا تجھے غزل ثمردار نہ سمجھا جائے

منتظر جن کا ہے تو جب وہ ادھر سے گزریں
تو کہیں راہ کی دیوار نہ سمجھا جائے

تو ہمیں دادِ ہنر دے کہ نہ دے فکر یہ ہے
ناشناسی ترا معیار نہ سمجھا جائے

اس کے ہی واسطے پیدا کیا انسانوں کو
دردِ دل چارہ ہے آزار نہ سمجھا جائے

کوئی تخلیق بلا مقصدِ تخلیق نہیں
سانپ کے زہر کو بیکار نہ سمجھا جائے

خیر و شر کی ہمیں تفریق بتائی اس نے
علم ہے نور اسے نار نہ سمجھا جائے

ترک روزہ ہوا ناساز طبیعت کے سبب
کچھ اسے فرض سے انکار نہ سمجھا جائے

چھوڑ دیں دعوت افطار بھی توبہ توبہ
ہمیں اتنا بھی خطاکار نہ سمجھا جائے

دولت عشق سے بڑھ کر نہیں دولت گلزار
فقر میں بھی ہمیں نادار نہ سمجھا جائے

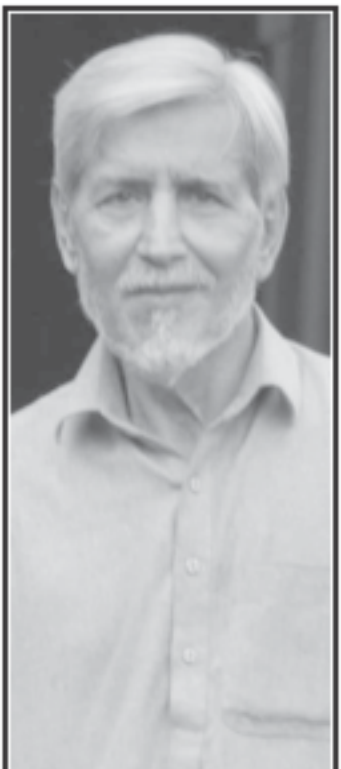

گلزار بخاری

غزل

نجانے کیسے لپٹ گئی ہیں مرے بدن سے ہزار آنکھیں
میں سونا چاہوں تو سونے دیتی نہیں مجھے سوگوار آنکھیں

کسی پہاڑی پہ جا کے تنہا، گئے دنوں کو بلا کے تنہا
میں جب بھی رویا تو میرے ہمراہ رو پڑیں وہ آبشار آنکھیں

جہاں ملے تھے تم آخری بار دل گرفتہ، بہ چشمِ گریاں
پڑی ملیں گی اسی جگہ آج بھی سرِ کوہسار آنکھیں

گئے تھے جس دم سفر پہ تم، دو چراغ جلتے تھے زیرِ ابرو
اب آئے ہو تو دریدہ دامن، لہو بدن، تار تار آنکھیں

میں واپس آیا تو میرے آنے تلک قیامت گزر چکی تھی
مگر بچھی تھیں تمام رستوں پہ جا بجا بے شمار آنکھیں

کبھی مجھے دور سے بلاتی، کبھی مجھے دیر تک رُلاتی
دکھائی دیتی ہیں اب بھی کھڑکی کے پار وہ گریہ بار آنکھیں

بس اتنا سا یاد ہے کہ اک دن وہ اُتریں آبِ حیات لے کر
مگر نہیں اتنا یاد پھر کیسے لے گئیں سوئے دار آنکھیں

اگر کبھی تم محبتوں کے سفر پہ نکلو تو یاد رکھنا
اسی سفر میں ہوئے ہیں اکثر دھواں دھواں دل، غبار آنکھیں

ہماری آنکھوں کی آئنہ گاہ میں کسی دن اتر کے دیکھو
دکھائی دیں گی تمھیں ہر اک سُو قطار اندر قطار آنکھیں

ہماری آنکھوں پہ شک نہ کرنا، اگر کبھی تم نے شک کیا تو
یقین کرنا کہ ہم اسی دن لہو میں لیں گے اُتار آنکھیں

اگر تمھیں اس سے پیار ہے تو، اسے کوئی اور دکھ نہ دینا
اسے کبھی نہ دکھانا جا کر یہ زرد چہرہ افگار آنکھیں

کسی دریچے کے طاق میں ہی جلا جلا کر اگر بجھا دیں
انیسؔ جاں! پھر کہاں سے لاؤ گے مانگ کر تم ادھار آنکھیں

محمد انیس انصاری

غزل

وہ جُھریوں سے لکھی داستان دیکھتا ہے
زمانہ رُخ پہ پڑے سب نشان دیکھتا ہے

شِکار کرنے کے کس نے اصول بدلے ہیں
جو شیر اپنے لیے بھی مچان دیکھتا ہے

یہ زلزلہ تو مرے واسطے ہی آیا تھا
گِرا کے فخر سے میرا مکان دیکھتا ہے

وہ دل کی بات سُنانے کے واسطے اکثر
دیارِ غیر میں اک ہم زبان دیکھتا ہے

اُسے غرض نہیں ٹوٹے ہوئے پروں سے کوئی
زمانہ بس تری اُونچی اُڑان دیکھتا ہے

وہ کیا ہے؟ کون ہے؟ کچھ جانتا نہیں لیکن
جو سب کا نام و نسب، خاندان دیکھتا ہے

جوان کھیتی پہ برسات جب بھی ہوتی ہے
اُٹھا کے ہات فلک کو کِسان دیکھتا ہے

زمین زادوں کو اپنا خدا سمجھ کر کیوں
عذاب دیں تو سُوئے آسمان دیکھتا ہے

جو آئیں شام و نجف، کربلا، مدینے سے
اُٹھا کے ایڑھیاں ان کو جہان دیکھتا ہے

عقیل آج بھی ماں باپ جس کے زندہ ہوں
دعا کا سر پہ سدا سائبان دیکھتا ہے

عقیل رحمانی

غزل

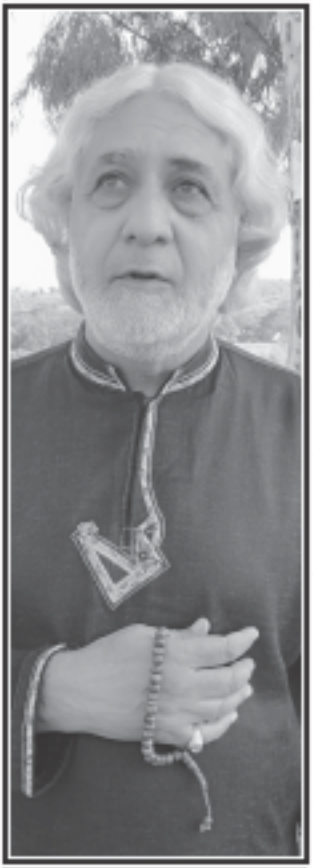

کہیں پر سنگِ نفرت اور کہیں بادِ شرر آئے
کسی شاخِ جنوں پر پھر بھلا کیسے ثمر آئے

جہاں ہر شخص اپنے خون کی تیرہ ردا میں ہو
وہاں زندانِ ظلمت میں کوئی کیسے نظر آئے

جسے اہلِ قلم میرے ملائک میں نہ لکھ پائیں
قیادت کے لیے اب تو کوئی ایسا بشر آئے

کہیں پر بال و پر ہیں اور کہیں اجسام کے ٹکڑے
عقابوں کی یہ بستی ہے کہاں اچھی خبر آئے

کھڑا ہوں ساحلِ عمرِ رواں پر آس یہ لے کر
کبھی اشکوں کی موجوں میں کوئی حرفِ گہر آئے

مرے دل میں یہی اقبال برسوں سے رہی خواہش
مری فصلِ لہو پر بھی کبھی تو کچھ ثمر آئے

اقبال سروبہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھیں خوشبو کی طرح اُٹھ کے بکھر جاتی تھیں
جانے کس موج میں وہ جانِ صبا اپنا تھا

غزل

ہجر کی امامت میں وصل بھی نمازی ہے
عشق کچھ حقیقی ہے اور کچھ مجازی ہے

کیسی گرم جوشی تھی کیسی سرفروشی تھی
کیسی سرد مہری ہے کیسی بے نیازی ہے

دم درود پڑھ کے بھی منبروں پہ چڑھ کے بھی
آج کے زمانے میں صرف جعل سازی ہے

کون سا فسادی ہے کون سا جہادی ہے
اپنے اپنے فرقے کا ہر شہید غازی ہے

وہ گیا زمانہ کیا یہ نیا زمانہ کیا
وہ بھی رنگ بازی تھی یہ بھی رنگ بازی ہے

صبر وہ اماموں کا جبر وہ غلاموں کا
کربلا کے پیاسوں کی یاد اب بھی تازی ہے

اور کیا میسر ہے اس قمار خانے میں
صرف اب لگانے کو جان ہی کی بازی ہے

جنگ ہے اناؤں کی اور انتہاؤں کی
کونسی ہزیمت ہے کیسی سرفرازی ہے

گفتگو گھمائیں کیا بات کو پھرائیں کیا
وقت کی عدالت میں پھر شریح قاضی ہے

مسعود احمد

غزلیں

جو تیرے نام کو دل بھول جانے لگتا ہے
مرا حریف وہیں سر اٹھانے لگتا ہے

جو سرخ پھول نکلتے ہیں گھر کی بیلوں پر
تو دل کے زخم پہ بھی رنگ آنے لگتا ہے

دلوں میں چلتی ہے جب سرد مہریوں کی ہوا
تو یار یار سے آنکھیں چرانے لگتا ہے

وہی تو ایک سبب ہے مری تباہی کا
جو مجھ کو دیکھ کے آنسو بہانے لگتا ہے

میں اس کے ہاتھ میں آیا ہوا کھلونا ہوں
جسے وہ توڑ کے پھر سے بنانے لگتا ہے

سمجھ میں آتی نہیں اس کی شعبدہ بازی
رلا رلا کے جو مجھ کو ہنسانے لگتا ہے

مجھے دکھاتا ہے پہلے وہ اک حسیں منظر
پھر اور اور ہی منظر دکھانے لگتا ہے

یہ کار عشق سدا توڑتا ہے اندر سے
یہ جان لے کے ہی فخری ٹھکانے لگتا ہے

زاہد فخری

چمکتی شامیں تھیں اور دلربا سویرے تھے
ہمارے چاروں طرف خوشبوؤں کے ڈیرے تھے

وہ صحبتیں روٹھ گئیں جن سے دوستی تھی بہت
کہاں گئے جو بڑے رازداں اندھیرے تھے

گئے دنوں میں گھنا پیڑ بھی تھا آنگن میں
ہمارے ساتھ پرندوں کے بھی بسیرے تھے

وہ کون تھا کہ جو ہالہ کئے ہوئے تھا ہمیں
وہ کس کا پیار تھا اور بازوؤں کے گھیرے تھے

بہت نہائے ہیں ہم آنسوؤں کی بارش میں
کسی کی یاد کے بادل بڑے گھنیرے تھے

ہمارے پاؤں میں کانٹے چبھے تو یاد آیا
کسی نے رہ میں کبھی پھول بھی بکھیرے تھے

یہیں تو فخری کوئی راہ اپنی تکتا تھا
اسی گلی میں کبھی رات دن کے پھیرے تھے

غزل

کوئی تعبیر مجھ کو بتائے
خواب میں ریت کے گھر بنائے

وقت پر جو نہیں کام آئے
ایسے اپنوں سے اچھے پرائے

شام ہونے کو ہے جان لے تُو
قد سے جب بڑھنے لگ جائیں سائے

میرے بارے میں پروا نہیں اب
آپ کی چاہے جو بھی ہو رائے

رات کو مان جاؤں اگر وہ
مجھ کو سورج بجھا کر دکھائے

زندگی راہ گم کردہ راہی
اور ہے یہ عالمِ کن سرائے

آخری عشق کرنا ہے راحت
ایک کم سن اگر مان جائے

راحت سرحدی

غزل

میں زندگی منانے کہاں سے کہاں گیا؟
واں سے یہاں تک آیا، یہاں سے کہاں گیا؟

آج اِس جہان میں تھا تو کل اُس جہان میں
کچھ دن ہوئے میں دونوں جہاں سے کہاں گیا؟

باہر سے جھانکتا ہوں، بتاتا نہیں مگر
ایک اک مکین کون و مکاں سے کہاں گیا؟

کچھ دن تمھارے کنجِ بدن میں گزار کر
بھولا ہی رہنے دو میں وہاں سے کہاں گیا؟

یہ بات جب کھلی کہ جب آواز پڑ گئی
آگے، میں اِتنا آگے، زباں سے کہاں گیا؟

اک شخص جو گیا ہے، اُسی کو پتا نہ ہو
اک شہر تھا جہاں میں، جہاں سے کہاں گیا؟

وہ جو گلی کے راستے آیا گمان میں
جب آ گیا تو پھر وہ گماں سے کہاں گیا؟

اے منظرِ جہاں، کبھی تُو بھی تو کچھ بتا
اک شخص میرے منظرِ جاں سے کہاں گیا؟

شاہین عباس

غزل

اس کے جانے سے وہ خلا ہوا ہے
دل میں محشر کوئی بپا ہوا ہے

اس کے جانے سے ایسے ویراں ہے
جیسے کہ شہرِ دل لٹا ہوا ہے

بندگی کا نہیں سلیقہ جسے
آج سنتے ہیں وہ خدا ہوا ہے

جس کی پہچان میرے نام سے تھی
آج میرا ہی وہ پتا ہوا ہے

جس کی شاخوں پہ آشیاں تھے کئی
وہ گھنا پیڑ بھی کٹا ہوا ہے

میں ہدف سے ذرا ہلا بھی نہیں
کیوں نشانہ ترا خطا ہوا ہے

اک قیامت بچھڑنا تھا جس کا
جانے کس دل سے وہ جدا ہوا ہے

ضبط کا یارا اب نہیں ہے جلیل
سیل آنکھوں میں اک رکا ہوا ہے

احمد جلیل

غزل

اسے معلوم ہے کس چیز کی کتنی ضرورت ہے
مجھے دیتا ہے وہ جس چیز کی جتنی ضرورت ہے

مرا بیٹا خود اپنے فیصلے کرنے لگا جب سے
کھلا مجھ پر کہ بچوں کو مری کتنی ضرورت ہے

مرے بیٹے پلٹ آؤ تمہیں بتلا نہیں سکتا
ترے ماں باپ کو، گھر کو تری کتنی ضرورت ہے

یقیناً وہ وہاں پر بھی ہماری لاج رکھے گا
جو کہتا ہے یہاں لے جاؤ تم جتنی ضرورت ہے

حصولِ رزق آساں کر، مری بخشش کا ساماں کر
نہیں کچھ اور خواہش، میری بس اتنی ضرورت ہے

اکرم ناصر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

رنگ کہتے ہیں کہانی میری
کس کی خوشبو تھی جوانی میری

غزل

رخسار پہ ہے زلف کا اظہار مختلف
لگ جائے کوئی روگ نہ اس بار مختلف

اس بار تو ہمیں بھی بلایا ہے بزم میں
اس بار تو رویہ ہے سرکار مختلف

دل کی حسین بستی کو تاراج کر گئے
وہ زاویے نگاہ کے خم دار مختلف

ہر لمحہ لے کے آتا ہے پہنائیاں نئی
ہر صورتِ گلاب ہے ہر بار مختلف

مسند نشیں ہیں چاک گریباں، دریدہ دل
ہے شہنشاہِ عشق کا دربار مختلف

ہے بلبلوں میں اور گلوں میں ٹھنی ہوئی
میرے چمن میں اب کے ہے پیکار مختلف

ہم بھی رضا ہیں آئینے پر گردِ ریت کے
گفتار بے غبار تو کردار مختلف

رضا اللہ حیدر

غزل

نظر آتا نہیں ہے اب کہیں وہ
سنا ہے ہو گیا گوشہ نشیں وہ

اسے ازبر ہیں سارے شعر میرے
نہیں پہچانتا مجھ کو نہیں وہ

ہوا دیمک زدہ سا جسم جب سے
نظر آتا بہت ہے اب حسیں وہ

اندھیرے چار سو پھیلے ہوئے ہیں
ستارہ انکھیں ہیں روشن جبیں وہ

خیالی آسماں کے خواب دیکھوں
کہ آنے کا نہیں ہے اب زمیں وہ

بھٹکنے کی ضرورت کیا پڑی تھی
نہ دنیا ہے تمہاری اور نہ دیں وہ

اسے دل دے کہ اب پچھتا رہے ہو
نہیں ہرگز نہیں دل کا امیں وہ

یہاں ویرانیاں آباد ہیں اب
کبھی آباد تھا ہر دم یہیں وہ

شکایت کیوں عظیم بے نوا سے
ابھی کیا ہے نہیں جاں کے قریں وہ

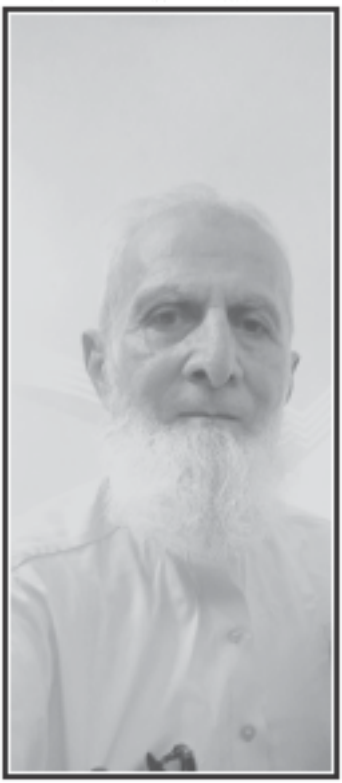

ابن عظیم فاطمی

غزل

اجالے کو گھٹا روکے ہوئے ہے
اندھیرے کو دیا روکے ہوئے ہے

تمہاری یہ جو دیوار انا ہے
مری ساری انا روکے ہوئے ہے

مرا دشمن جو میری گھات میں ہے
اسے میرا خدا روکے ہوئے ہے

مرے اوپر بلائے ناگہاں کو
کوئی دست دعا روکے ہوئے ہے

کہاں ڈھونڈوں میں اپنی اس نوا کو
جو میرا ہم نوا روکے ہوئے ہے

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سوچو تو کچھ نہ سمجھو، سمجھو تو کچھ نہ بولو
پھر چپ کا حُسن دیکھو، بیکار لب نہ کھولو

غزل

دل میں پہنچے یہ ہر اِک گنج نہاں تک پہنچے
[میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے]

میرے اِحساس کی گہرائی کو محسوس کرے
کوئی ہمراز مرے وہم و گماں تک پہنچے

چارہ گر کو بھی مرے دَرد کا اِدراک نہیں
کوئی تو ہو جو مرے سوزِ نہاں تک پہنچے

مجھ کو دُشمن کے ٹھکانے کا پتہ دیتا ہے
کوئی پتھر جو کھلونوں کی دُکاں تک پہنچے

آج کل میرا بھی ہے صحرانوردوں میں شمار
دیکھئے جذبِ جنوں اور کہاں تک پہنچے

ہنس کے یُوں موت کی وادی میں اُتر جاؤں گا
پھُول مَسکاتا ہوا جیسے خزاں تک پہنچے

شعر کے علم کا ہم نے فقط اَبجد سیکھا
عمر بھر کی ہے ریاضت تو یہاں تک پہنچے

ہر طرف ظُلم کا پہرہ ہے نئے کربل میں
کس طرح پیاسا کوئی آبِ رواں تک پہنچے

جبر کے سائے میں قُرآن سناتا ہے وہی
کربلا سہہ کے جو سَر نوکِ سناں تک پہنچے

جاں بہ لب جان سے پیاروں کو کہاں تک دیکھوں
جام کوئی تو مرے تشنہ دہاں تک پہنچے

غیر محفوظ ہیں گھر میں بھی مرے شہر کے لوگ
کوئی پھر کیسے بھلا جائے اَماں تک پہنچے

یاد کرتا ہے بھلے وقت کو رو دیتا ہے
عیش و عشرت سے گزر کر جو فغاں تک پہنچے

مطمئن یُوں ہے درِ حُسن پہ درماندۂ عشق
جیسے بے گھر ہو کوئی اور مکاں تک پہنچے

عشق ہوں میری خردمندوں سے بنتی ہی نہیں
کیسے اِدراک مرا سود و زیاں تک پہنچے

جس کو مالک سے وفا کرنے کا اِدراک نہیں
عشق والوں سے ملے خُوئے سگاں تک پہنچے

بات جو کہہ دی وہ آتی نہیں واپس مُنہ میں
لَوٹ کر تیر بھلا کیسے کماں تک پہنچے

ہم رہِ عشق میں منزل کا پتہ بھول گئے
آبلہ پائی لئے کوئے بتاں تک پہنچے

اِس سے پہلے کہ شبِ تار میں بُجھ جائے نظر
کوئی اُمیدِ سحر بن کے یہاں تک پہنچے

اکرم سحر فارانی

غزل

عشق سے توبہ، یہ آیندہ نہیں کرنا ہے
دل کو اس دیش کا باشندہ نہیں کرنا ہے

عشق ظالم ہے پنہ مانگتی ہے اس سے موت
ایسے فرعون کو پھر زندہ نہیں کرنا ہے

اس کو کہہ دو کہ کسی اور کو مزدور کرے
دل کو اب عشق کا کارندہ نہیں کرنا ہے

بھیجنا ہے مجھے اس بار خرد کو اُس پار
یہ جنوں اب کے نمائندہ نہیں کرنا ہے

لوٹ لیتا ہے یہ کم بخت سکون اور قرار
جوش نے ہوش کا تابندہ نہیں کرنا ہے

میرے ملنے سے نظر جس کی ندامت سے جُھکے
میں نے اُس شخص کو شرمندہ نہیں کرنا ہے

رانا سعید دوشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد ، خلا خلا وہی سودائے آگہی
صحرا نورد راہیٔ افلاک ہو گئے

غزل

شاخ در شاخ لہو ہی سے گُلِ تر دیکھے
آشیانوں میں پرندوں کے مگر سر دیکھے

خود بھی ڈرپے تھے، مگر اوروں کو بھی لے ڈوبے
ہم نے دریائے سیاست کے شناور دیکھے

مسندِ شاہی پہ نازاں جو ہُوا کرتے تھے
بھیک کے کاسے لیے وہ ہی گداگر دیکھے

درد انساں ہی رہا جینے کا مقصد جن کا
زخم گھمائے ہوئے دنیا میں پیمبر دیکھے

یہ تماشا بھی تو بازار بتاں میں دیکھا
پارسا چادرِ رندی میں ہی شب بھر دیکھے

چھوڑ میدان گئے خوف کے مارے سب ہی
میں نے تاریخ میں ایسے ہی دِلاور دیکھے

سچ ہے تاریخ میں لاکھوں میں ستم گر گزرے
کانپ اُٹھتا ہوں وطن میں وہ ستم گر دیکھے

جسارت خیالی

غزل

ہستی ہے یا سراب ہے تجھ کو خبر نہیں
دنیا میں کیا عذاب ہے تجھ کو خبر نہیں

اپنے عمل کا دینا پڑے گا جواب بھی
محشر میں کیا حساب ہے تجھ کو خبر نہیں

پڑھتا ہے سرسری تو کہانی کے رنگ میں
یہ کون سی کتاب ہے تجھ کو خبر نہیں

کس نے دیئے ہیں زخم ستاروں کو آج تک
کیوں سرخ آفتاب ہے تجھ کو خبر نہیں

کس نے کیا ہے وار چمن کے شباب پر
کیوں زرد ہر گلاب ہے تجھ کو خبر نہیں

کیوں لڑکھڑا رہی ہے نئی نسل آج کل
ہاتھوں میں کیوں شراب ہے تجھ کو خبر نہیں

اب تک کسی کے جھوٹ کا پردہ نہیں اٹھا
چہرے پہ کیوں نقاب ہے تجھ کو خبر نہیں

کھل جائے گی ضرور کسی روز آنکھ بھی
دنیا تمام خواب ہے تجھ کو خبر نہیں

لمحوں کی ہے گرفت میں شاید جہان بھی
ہر وقت احتساب ہے تجھ کو خبر نہیں

محمد نوید مرزا

غزل

کہاں تھا خاک میں ڈھلنے سے پہلے
ستارہ ٹوٹ کر گرنے سے پہلے

وہ شعلہ سر بلندی تھا دیے کی
بھڑک اٹھا تھا جو بجھنے سے پہلے

سکوتِ آب تھا اور ایک پتھر
ہزاروں دائرے بننے سے پہلے

کہاں گہرائیوں پر دسترس تھی
سمندر میں قدم رکھنے سے پہلے

جہانِ نو بہ نو کی دید ہو گی
یہ اندازہ نہ تھا اڑنے سے سے پہلے

ٹھکانہ ڈھونڈتی پھرتی تھی شاید
اداسی میرے گھر آنے سے پہلے

مری شدت پسندی یاد رکھنا
کوئی بھی حکم فرمانے سے پہلے

ہمیشہ سوچنا پڑتا ہے آکاش
کسی سے مشورہ کرنے سے پہلے

احمد سبحانی آکاش

پنج غزلہ

دل کی بات پہ دُکھا ہوا تھا
یاد پڑتا نہیں کہ کیا ہُوا تھا

اس سے پہلے کہ دل سنبھل پاتا
اشک آنکھوں میں آ چکا ہُوا تھا

سارے خاکی تھے اور خاک سے تھے
میں تری یاد سے بنا ہُوا تھا

گھر میں اتنی تھیں تیری تصویریں
خود میں دیوار سے لگا ہُوا تھا

خود میں موجود بھی رہا لیکن
میں کہیں اور بھی گیا ہُوا تھا

ہم بھی مٹی کے تھے اے زہرہ جمال!
تیری مٹی کو کیا لگا ہُوا تھا

اس سے پہلے کہ نیند پاس آتی
میں بہت دُور جا چکا ہُوا تھا

اس کہانی میں شاہزادہ سلیم
شاہزادی سے جب جدا ہُوا تھا

☆

میں کہ اپنی جگہ رُکا ہوا تھا
تیر تو آپ کا خطا ہُوا تھا

کوئی مشکل اسے نہ پیش آئی
وہ سہولت سے بے وفا ہُوا تھا

سوکھ جائے نہ تجھ سے دوری میں
تیری چُھونے سے جو ہرا ہُوا تھا

دشتِ ہجراں سے بازیاب ہُوا
وہ جو آنکھوں میں لاپتا ہُوا تھا

دل لگایا تھا ایک پتھر سے
جس سے پتھر کو مسئلہ ہُوا تھا

صبحِ کاذب کہاں سے آ نکلی
چاند تاروں سے دل لگا ہُوا تھا

رات میں سو گیا تو ماہ و نجوم
پُوچھتے ہیں، سلیم! کیا ہُوا تھا؟

☆

یاد ہے جو مرا کہا ہُوا تھا؟
تو نے مانا نہیں تو کیا ہُوا تھا؟

دل ہی دل تھا میں سر سے پاؤں تلک
جو تری یاد سے بھرا ہُوا تھا

کائناتیں ہیں گردشوں میں مدام
آسماوں میں ایسا کیا ہُوا تھا؟

رات پھر چاند میری کھڑکی میں
جانے کیا سوچ کے رُکا ہوا تھا

بھائی آنگن سے پیڑ کاٹتا ہے
جس کے سائے میں خود بڑا ہوا تھا

میری جاں تک ہُوئی ہے صرف وفا
جانے اُس بے وفا کا کیا ہُوا تھا؟

نام اچھا لگا تھا ساگر کا
تیرے ہونٹوں سے جب ادا ہوا تھا

☆

میں اُن آنکھوں میں لاپتا ہُوا تھا
بازیابی تو معجزہ ہُوا تھا

پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا
اپنے اندر جو کھو گیا ہوا تھا

سب کا سب تھا میں اپنے بس میں مگر
صرف دل جو تجھے لگا ہُوا تھا

دکھ بڑوں کے بڑے نہیں ہوتے
میں تو یہ سوچ کے بڑا ہوا تھا

مرنے والے کے ایک بازو پر
شاید اک نام بھی گُدا ہوا تھا

دکھ سے محفوظ کیا رہے کوئی
لوحِ محفوظ پر لِکھا ہُوا تھا

میں کہانی کا آخری کردار
جو کہانی کے بعد وا ہوا تھا

جانتا ہوں سلیم ساگر کا
میرے اندر پلا بڑا ہوا تھا

☆

زہر پیالے میں جو بھرا ہوا تھا
وہ تری یاد میں مِلا ہوا تھا

کھا گیا ہے جو اُس کا پچھتاوا
میرے نقصان سے لگا ہوا تھا

بے وفا سے وفائیں کی گئیں تھیں
پھول صحرا میں جا کِھلا ہُوا تھا

سارے گھر میں تلاش خود کو کیا
آئنے میں کہیں چھپا ہُوا تھا

میں نہ ہُوں گا تو جانے کیا ہو یاں
میں نہیں تھا تو جانے کیا ہُوا تھا

دل میں پیوست ہے جو تیر نظر
زہرِ احساس میں بجھا ہُوا تھا

جب مجھے ڈھونڈتا وہ پہنچا یہاں
میں اُسے ڈھونڈنے گیا ہُوا تھا

اصل میں بے وفا نہیں تھا سلیم
جو کہانی میں بے وفا ہوا تھا

محمد سلیم ساگر

غزل

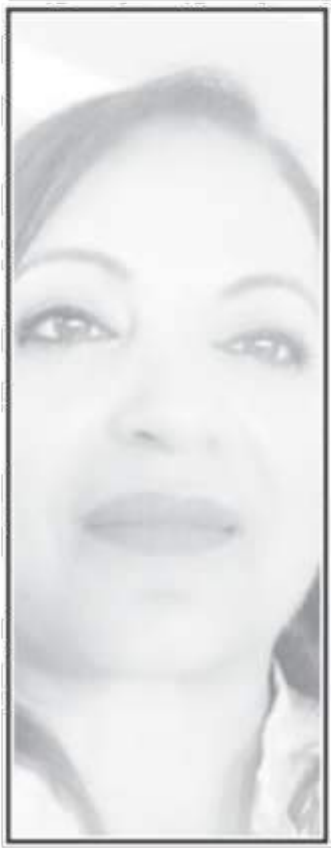

رخشندہ نوید

ہم اس بدلی کالی سے کتنا ڈرتے ہیں
کمرے کی جالی سے کتنا ڈرتے ہیں

پھولوں کا یہ جُھنڈ بھی کر دے گا مسحور
ہری بھری ڈالی سے کتنا ڈرتے ہیں

چوڑیوں کی مانند نہیں چھنکی پھر بھی
گوش کی اس بالی سے کتنا ڈرتے ہیں

بٹیا کو ہم سب نے مسئلہ جان لیا
ہاتھوں کی پالی سے کتنا ڈرتے ہیں

خوفزدہ دربان ہے دن کے ڈھلتے ہی
شہر کی رکھوالی سے کتنا ڈرتے ہیں

چھ فٹ کے انساں بھی خوفزدہ دیکھے
وہ بھی گھر والی سے کتنا ڈرتے ہیں

سڑک پہ ہوتی مار پیٹ سے رخشندہ
جھگڑے اور گالی سے کتنا ڈرتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ڈھوپ کی ، ریت کی ، تنہائی کی ، ویرانی کی
ہم نے اِک عمر ترے غم کی نگہبانی کی

غزل

میری دنیا ، مرا دیار ، نہ پوچھ
ایک ہی بات بار بار ، نہ پوچھ

میں نے کیسے کیا ہے پار ، نہ پوچھ
یہ خرابہ یہ خارزار ، نہ پوچھ

تیرے کتنے ہیں چاہنے والے
میرے کتنے ہیں سوگوار ، نہ پوچھ

تیری فرقت میں زندگی میری
کیسے گذری ہے میرے یار ، نہ پوچھ

دیکھتا جا مرے خساروں کو
کیسے کرتا ہوں کاروبار ، نہ پوچھ

تیری آنکھوں میں ڈوبنے کے لئے
کوئی کتنا ہے بیقرار ، نہ پوچھ

کوئی نام و نشاں نہیں میرا
میری تُربت ، مرا مزار ، نہ پوچھ

انصر حسن

غزل

زندگی جی سکے نہ جیتے ہوئے
آنکھ بھر آئی آج پیتے ہوئے

چُبھ گئی ہاتھ میں مرے سوئی
رات ، دامن کے چاک سیتے ہوئے

تھک کے گرتا ہوں جب میں بستر پر
ڈسنے لگتے ہیں لمحے بیتے ہوئے

جو مجھے زندگی سے پیارا تھا
اس کو دشمن مرے چہیتے ہوئے

مجھ سے لوگوں کو مسئلہ یہ ہے
دیکھ سکتے نہیں ہیں جیتے ہوئے

رات ڈھلتی ہے سسکیوں کے بیچ
دن نکلتا ہے اشک پیتے ہوئے

عمران اعوان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گھٹتے گھٹتے میں کتابِ عشق میں
ایک سطرِ انتسابی ہو گیا

غزل

اُسکے انداز تغافل نے رلایا برسوں
بھولنا چاہا اُسے بھول نہ پایا برسوں

ایک جا کرتا رہا ٹوٹے ہوئے خواب اپنے
کام ناکام رہا خود کو گنوایا برسوں

دیدہ تر سے سر بزم سنا دی اُس نے
میں نے جس بات کو دنیا سے چھپایا برسوں

ایک دو پل کی خوشی بھی نہ مرے ساتھ رہی
رنج و غم نے تو مرا ساتھ نبھایا برسوں

مجھ سا جی دار نہ دنیا کو ملے گا جس نے
اپنی بربادی کا خود جشن منایا برسوں

قطرہ اشک میں پھولوں کی ملا کر خوشبو
دل کے ویرانے کو گلزار بنایا برسوں

دیکھ کر چہرہ جتاتا تھا بہت پیار مگر
بے وفا ایسا کہ ملنے بھی نہ آیا برسوں

اپنے اندر کوئی آباد ہے کتنا طاہر
ہے یہی بھید جسے میں نے نہ پایا برسوں

طاہر ناصر علی

غزل

جب کبھی وہ آتے تھے
پھول ہم سجاتے تھے

جب وہ روٹھ جاتے تھے
ہم اُنہیں مناتے تھے

بچپنے کی عادت تھی
تتلیاں اُڑاتے تھے

بارشوں کے موسم میں
کشتیاں بناتے تھے

نیم جان پلکوں پر
خواب جھلملاتے تھے

ریت پر بنا کر گھر
خود ہی پھر مٹاتے تھے

اپنے ہجر کے قصے
دیر تک سناتے تھے

دوپہر کی تلخیاں
شب میں بھول جاتے تھے

طلعت شبیر

غزل

بونے تھے مگر سائے پہ اترائے بڑے لوگ
جو خود کو سمجھتے تھے بڑے، آئے بڑے لوگ

تھے کون ، تھا کیا شجرہ نسب سامنے آیا
لازم تھی جہاں، بات نہ کر پائے بڑے لوگ

کس کس کو سمجھتے رہے اپنے سے زیادہ
جب وقت پڑا پھر جو سمجھ آئے بڑے لوگ

یہ لوگ بڑے ہیں ہی نہیں، ہم نے کہا تھا
اوقات پہ دیکھا نا ، اتر آئے بڑے لوگ

اک شخص کے بارے میں بہت بول رہے تھے
وہ سامنے آیا تو جو گھبرائے بڑے لوگ

جب مرتا رہا پوچھنے آیا نہیں کوئی
مرنے کی خبر سن کے صغیر آئے بڑے لوگ

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بے رنگ سا، بے روح سا، بے جان سا دن ہے
تا حدِّ نظر پھر وہی ویران سا دن ہے

غزل

یہ کاروبارِ زمانہ تمام ہوتے ہی
مکان بولنے لگتے ہیں شام ہوتے ہی

مری غزل کے سب الفاظ مسکراتے ہیں
کسی کی یاد سے محوِ کلام ہوتے ہی

جو چل رہے ہیں قدم سے قدم ملائے ہوئے
نظر نہ آئیں گے وہ اپنا کام ہوتے ہی

اسی لئے تو مَیں گمنام رہنا چاہتا ہوں
زمیں پہ رہتے نہیں لوگ نام ہوتے ہی

چمک اٹھا ہے مقدر، وہ حاضری ہوئی ہے
میں بادشاہ ہوا ہوں، غلام ہوتے ہی

قیام کرنا ہے کچھ دیر اِس سرائے میں
کہوں گا شکریہ! مَیں انتظام ہوتے ہی

ہَوائیں سر کو پٹکتی ہیں بین کرتے ہوئے
ظہور شام کی گلیوں میں شام ہوتے ہی

ظہور چوہان

غزل

اُداسیوں کا سفر ختم کر رہی ہوں ابھی
میں زندگی کے لیے روز مر رہی ہوں ابھی

ٹھہر نہ جاؤں کہیں میں ادھورے مصرع میں
میں لفظ لفظ غزل میں اُتر رہی ہوں ابھی

خود اپنے حال کو دیکھوں تو خوف آتا ہے
مری بلا سے کہاں کس سے ڈر رہی ہوں ابھی

طویل عمر کی یکجائی کی شکست ہے یہ
کہ ریزہ ریزہ سی ہو کر بکھر رہی ہوں ابھی

مرے وجود کو سرطان غرق کر دے گا
میں اپنے زخم لیے خود ابھر رہی ہوں ابھی

مری کہانی مری شاعری خدا حافظ
لو اختتام کی سیڑھی اتر رہی ہوں ابھی

ثمینہ ختم کہاں ہو گا یہ سفر میرا
میں اپنے آپ کی حد سے گزر رہی ہوں ابھی

ثمینہ سیّد

غزل

ہم جہاں بھی جہاں میں رہتے ہیں
نگہِ آسماں میں رہتے ہیں

آپ تک کس طرح رسائی ہو
آپ تو لامکاں میں رہتے ہیں

دشمنوں کو کوئی خبر کر دے
ہم دلِ دوستاں میں رہتے ہیں

تیری نظروں سے خوف آتا ہے
تجھ سے چھپ کر جہاں میں رہتے ہیں

روشن انجامِ جستجو معلوم
کوششِ رائگاں میں رہتے ہیں

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا کہوں شہرِ غزالاں کبھی دیکھا نہ تھا
جانِ جاں! میں نے یہ زنداں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

غزل

باسی ہیں ہم زمین کے یا آسماں کے ہیں
کوئی ہمیں بتائے کہ ہم کس جہاں کے ہیں

اب تک بھٹک رہے ہیں مکاں کی تلاش میں
طے کرنے والے مرحلے جو لامکاں کے ہیں

کوئی بری صدا پہ نہیں کان دھر رہا
گو چرچے ہر طرف بری آہ و فغاں کے ہیں

پہنچے بلندیوں پہ، پہ وقعت نہیں کوئی
ہم بھی غبار گویا کسی کارواں کے ہیں

جب سے زمیں پہ آئے ہیں، دل لگ نہیں رہا
یعنی کہ ہم ستارے کسی کہکشاں کے ہیں

بے لوث و پُر خلوص یہاں کوئی بھی نہیں
سودے سروں میں سب کے ہی سود و زیاں کے ہیں

اے کاش چشمِ نم کو زیارت ہو نیند کی
آنکھوں میں میری، خواب کئی مہ رُخاں کے ہیں

دریا و دشت دونوں بلاتے ہیں خواب میں
لگتا ہے یہ اشارے کسی امتحاں کے ہیں

رہتا ہے دل کے کمرے میں یادوں کا اِک ہجوم
اور ڈیرے میرے گرد ہرے رفتگاں کے ہیں

تحریر ہو سکی نہ جو قرطاس پر کبھی
کردار ہم بھی ایسی کسی داستاں کے ہیں

اشرف جو چل دیئے ہو بدن چھوڑ چھاڑ کے
کچھ تو کہو، تمھارے ارادے کہاں کے ہیں

اشرف نقوی

غزل

خواب تو راستہ دکھاتے ہیں
وقت کو خود ہی ہم گنواتے ہیں

آپ اداسی پہ نظم لکھتے ہیں
ہم اداسی کو گنگناتے ہیں

زندگی اتنی خوبصورت ہے
دکھ ملے بھی تو مسکراتے ہیں

یاد رکھتے ہیں راستے ہم کو
لوگ تو جلدی بھول جاتے ہیں

رنجشیں رکھ کے دل میں ملتے ہیں
انکے لہجے یہی بتاتے ہیں

دل لگی دل لگی ہی ہوتی ہے
زخم کیوں روگ بنتے جاتے ہیں

تم نے اک بار تو کہا ہوتا
شہر کے راستے بلاتے ہیں

ہم گزرتے نہیں وہاں سے اب
آنسو آنکھوں میں امڈے آتے ہیں

فیصلہ جس کا بھی تھا اچھا تھا
بات جو طے تھی ہم نبھاتے ہیں

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سورج اُبھرے تو زمیں پر سے اُٹھائے سائے
روشنی آئے مگر ساتھ نہ لائے سائے

غزل

قید لکھی کہ رہائی ہے ، بتا دو مجھ کو
فیصلہ جو بھی تمھارا ہے ، سنا دو مجھ کو

اور جینے کی خدارا نہ دعا دو مجھ کو
اس قدر بھی نہ محبت میں سزا دو مجھ کو

اپنا دکھ لے کے کہیں اور بھلا کیوں جاؤں
تم ہی مرہم ہو، مسیحا ہو ، شفا دو مجھ کو

زیست کی راہ میں چاہے نہ چلو ساتھ مرے
دل میں بس تھوڑی ، بہت تھوڑی جگہ دو مجھ کو

میں کوئی نقش ہوں تحریر ہوں یا کوئی لکیر
جو بھی ، جیسی ہوں بہرطور مٹا دو مجھ کو

حکم آیا ہے کہ اب خواب نہ دیکھے کوئی
نیند کی آنکھ سے فی الفور گرا دو مجھ کو

میری ہر سانس تمھارے ہی لیے چلتی ہے
ساتھ رہنا ہو تمھارے ، یہ دعا دو مجھ کو

خالدہ انور

غزل

میں نے سپنا دیکھا ہے
رات ہے ، سورج نکلا ہے

چپ نے اتنا شور کیا
سارا عالم سہما ہے

یادیں ناچتی پھرتی ہیں
کس نے ملنے آنا ہے

آندھی پوچھنے آئی ہے
تیرا دیپ تو جلتا ہے

مجھ کو ایسا لگتا ہے
قطرے میں اک دنیا ہے

سوچ مقدس وادی ہے
اس میں گم ہو جانا ہے

وقت ذرا سی دیر ٹھہر
یہ تخلیق کا لمحہ ہے

سید تحسین گیلانی

غزل

اسے خاطر میں ہم لاتے نہیں ہیں
کسی مشکل میں گھبراتے نہیں ہیں

جو عالی ظرف ہیں ، اپنی زباں پر
کبھی شکوے گلے لاتے نہیں ہیں

ہمیں معلوم ہے اوقات اپنی
سو ہم تاریخ دہراتے نہیں ہیں

دھمالیں ڈالتی ہیں قمریاں بھی
شجر ہی رقص فرماتے نہیں ہیں

کوئی دشمن بھی ہو مدِ مقابل
ہم اپنی پیٹھ دکھلاتے نہیں ہیں

سمجھتے ہیں وہ ہجرت کے معانی
پرندے لوٹ کر آتے نہیں ہیں

کسی موسم میں بھی اعجاز دانش
سخن کے پھول مرجھاتے نہیں ہیں

اعجاز دانش

غزل

کس یقیں کی ہمرہی میں، کس گماں تک آ گئے
ہم خدا کو ڈھونڈتے کوئے بتاں تک آ گئے

اک ہوس میں خواہشوں کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے
بے مہارے حسرتوں کے لا مکاں تک آ گئے

جب قیامت ہم پہ گزری تم رہے مصروف سب
جبکہ پرسش کے لیے نامہرباں تک آ گئے

اس طرف سے تم چلے اور اس طرف سے ہم چلے
تم کنارے پر رہے، ہم درمیاں تک آ گئے

اب یہاں ٹھہریں، پلٹ جائیں کہ ہو جائیں فنا
تم جہاں کا کہہ رہے تھے، ہم وہاں تک آ گئے

پہلے تم کہتے رہے یہ بات ہو گی آج ہی
جوں ہی رخ بدلا ہوا نے، کل کلاں تک آ گئے

ہر قدم پر بڑھ رہا ہے خوفِ احساسِ زیاں
لگ رہا ہے ہم بھی کنجِ رائگاں تک آ گئے

ہم سمجھتے تھے نکما کر دیا ہے عشق نے
نازش اپنے زیرِ پا تو آسماں تک آ گئے

شبیر نازش

غزل

کھلے کواڑوں پہ برف جمنے سے پہلے آنا
چراغ جلنے سے شام ڈھلنے سے پہلے آنا

اداس راہوں کی اڑتی مٹی پکارتی ہے
گھنے درختوں کے پتے گرنے سے پہلے آنا

پہاڑ ، بادل ، بکھرتی شامیں ، گلال منظر
ہماری باتوں کی فصل پکنے سے پہلے آنا

کوئی بھی لمحہ دوامیت کا نہیں ہے اصغر
ہماری سانسوں کے سرد پڑنے سے پہلے آنا

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زخم لگا تھا مگر لہو نہ بہا تھا
بحرِ خموشی تھا میں ، وہ سنگِ صدا تھا

غزل

شہر تیرا ہے زمیں اور زمانہ تیرا
آسمانوں پہ چمکتا ہے ستارا تیرا

رات کو ٹوٹ پڑے چاند ستارے مجھ پر
میں نے اک خواب میں دیکھا جو سراپا تیرا

میری بینائی میں محفوظ چمک ہے تیری
میری آنکھوں میں ہے ہنستا ہوا چہرا تیرا

روشنی پھیلتی جاتی ہے مرے چاروں طرف
دل کے آنگن میں بھی پھیلا ہے اجالا تیرا

چل پڑیں گے ترے ہمراہ سبھی سنگِ میل
کس میں ہمت ہے کہ روکے گا وہ رستہ تیرا

اک جھلک دیکھ لوں مل جائے شناسا کوئی
اس بھرے شہر میں خالی رہا کاسہ تیرا

چند دیواریں ہیں کر سکتے ہیں باتیں جن سے
کون سنتا ہے یہاں اور فسانہ تیرا

محمد اشرف کمال

غزل

اک بھیگی شام دو گھڑی آیا میں دام میں
اس کو بدل دیا گیا قیدِ دوام میں

دھڑکن کی لے پہ بجنے لگیں دلنشین ساز
ساتوں سروں کا حسن ہے اُس کے کلام میں

پرواز ہے یہ طائرِ دل کی فلک کے پار
کہتے ہیں جس کو پیار سبھی عرفِ عام میں

میں حسنِ اتفاق سے کل خود سے آ ملا
اس کو تلاش کرتے ہوئے اژدہام میں

نکلے جو ڈر سے کام تو ڈر سے نکالیے
تلوار کو سنبھال کے رکھیے نیام میں

کانٹوں سے دشمنی تھی تو رکھتے تمام عمر
پھولوں کو کیوں مسل دیا اس انتقام میں

اب پینے سے گریز سراسر گناہ ہے
وہ زہر جب ملا ہی چکا میرے جام میں

اکرم جاذب

غزل

تمھارے در پہ ہی اب آستاں بنائیں گے
جو کہہ دیا ہے تو بس میری جاں بنائیں گے

دیئے جلائیں گے ہم شام کی منڈیروں پر
ہَوا کے جھونکے اگرچہ دُھواں بنائیں گے

پھر اُس پہ آس کے پنچھی بھی سُر بکھیریں گے
بدن کے پیڑ سے اِک سائبان بنائیں گے

جو ہم پہ بیت گئی اُس کو بھول جائیں گے
جو ہو نہ پایا اُسے داستاں بنائیں گے

تمھارے نام کا تنکا بھی اُس میں رکھیں گے
اگر کہیں پہ کوئی آشیاں بنائیں گے

رہِ حیات میں خوشیاں بکھیرنے کے لیے
غمِ حیات کو وہم و گماں بنائیں گے

تری گلی میں گرائیں گے قطرہ قطرہ لہو
ہم اپنا ایسے بھی نام و نشاں بنائیں گے

نہ ہوں وصل کی لذّت سے مستفید وہی
سُلگتے جسم سے جو بھی دُھواں بنائیں گے

وَرق بنائیں گے ہم اپنے قلب کی صورت
لگا کے حاشیہ آہ و فغاں بنائیں گے

نئے خیال کی خوشبو سے جو مہکتی ہو
غزل کے واسطے ایسی زبانیں بنائیں گے

ملے گی اِن کو بھی آسودگی کبھی اِتنی
یہ در بدر کبھی اپنا مکاں بنائیں گے

یہ زندگی جسے داغ فنا لگا ہوا ہے
تری طلب میں اِسے جاوداں بنائیں گے

اگرچہ لوگ بھی فن میں کمال رکھتے ہیں
چراغ میری طرح کے کہاں بنائیں گے

گمان چاند کا گزرے گا جن پہ ظُلمت میں
ہم اپنی آنکھ میں ایسا سماں بنائیں گے

جو دوسروں کے لیے سائبان بنتے رہے
نبیل اُن کے لیے سائبان بنائیں گے

نبیل احمد نبیل

غزل

میں جب لوٹ کے گھر آیا تھا
میرے ساتھ مرا سایہ تھا

رستے میں جنگل پڑتا تھا
جنگل گھر کا ہم سایہ تھا

تم نے جان کے رستہ کاٹا
تم کو دیکھ کے گھبرایا تھا

اتنے سمے تم دور رہے ہو
پیڑوں نے یہ بتلایا تھا

گہرے سمندر سے جنگل پر
پانی سا سبزہ چھایا تھا

جیسے سمندر میں لہریں ہوں
ہوا سے جنگل لہرایا تھا

خواب میں کیا کچھ ہو سکتا ہے
خوابوں نے یہ دکھلایا تھا

تیتر تلیر مور چکور
سب نے رستہ سمجھایا تھا

راجہ عبدالقیوم

غزل

جبکہ منصف نے ہی سیاست کی
کیا ضرورت ہے پھر عدالت کی

سچ اکیلا تھا چڑھ گیا سولی
سب نے جب جھوٹ کی وکالت کی

دے دیا وہ بھی جو نہیں مانگا
منصفوں نے بھی کتنی عجلت کی

دشمنوں سے نہیں گلہ ہم کو
ہم نے تو خود سے ہی عداوت کی

جس نے ہم کو تباہ کر ڈالا
ہم نے اُس شخص سے محبت کی

تم نے جس پل میں خود کو بیچا تھا
وہ گھڑی تھی کوئی نحوست کی

پوچھنا آئینے سے فرصت میں
ہم پہ غیروں نے کیوں حکومت کی

خود کو بھی دو سزا کوئی جبران
تم نے بھی جرم میں اعانت کی

وسیم جبران

غزل

میں بھی کسی کا خواب ہوں تو بھی کسی کا خواب ہے
میں اِس طرف ہوں غمزدہ تو اُس طرف بیتاب ہے

کس سمت رُخ کر کے اُسے مانگوں دیارِ عشق میں
ہر سمت پتھر سے بنی اک جبر کی محراب ہے

اب دیکھتے ہیں کون کس کو ہو سکے گا دستیاب
میں بھی اِدھر نایاب ہوں تو بھی اُدھر نایاب ہے

ہر خواب کی ناؤ کو منزل بھی نہ شائد مل سکے
دریا میں ہر سُو بے بسی کا گونجتا گرداب ہے

تنہائیوں نے گھیر رکھا ہے نہ جانے کیوں مجھے
حالانکہ میرے چار سو اک حلقۂ احباب ہے

جیسے بھی ہو آگے نکل جاؤں میں اپنے بھائی سے
گر سوچیئے تو بس یہی ہر آدمی کا خواب ہے

کیسے بنے کوئی سہارا ڈوبنے والوں کا اب
چاروں طرف حرص و ہوس کا دوستو سیلاب ہے

سرور فرحان

غزل

کھلونے چھینے ہیں اور بچپن کی نیند جھپٹی ہے خواب رت میں
کٹھور لمحوں نے ننھے ہاتھوں کو بخشا کاسہ کتاب رت میں

دلِ فسردہ کی شاخ حسرت جھکی ہے برگ و ثمر سے خالی
دکھوں کی دیمک نے چاٹ رکھا ہے نخلِ جاں کو گلاب رت میں

ہمارے غم کا کوئی مداوا زمانے بھر سے نہ ہو سکے گا
جدائیوں کے عذاب اترے ہیں عین ہم پر شباب رت میں

اجارہ داری ہے نفرتوں کی منافقت کا ہے دور دورہ
چہار جانب ہی سازشوں کے ہیں جال پھیلے سراب رت میں

دلوں کی بستی اجاڑنے میں ذرا بھی تم کو جھجک نہیں ہے
خدا نے پوچھا تو کیا کہو گے نوید عاجز حساب رت میں

نوید عاجز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہرِ عمل میں بھاگتے لمحوں کے ساتھ بھاگ
خالد حصارِ فکر سے باہر نکل کے آ

غزل

مستحسن جامی

کچھ اس لئے شکستہ ہوا حوصلہ مرا
دیکھا نہیں ہے اس نے بھی دستِ دعا مرا

اس کے سوا کوئی بھی مرا ہم سخن نہیں
ناراض ہو نہ جائے کہیں آئنہ مرا

وحشت میں جھوم جھوم کے دیوار سے کہا
کوئی بھی اب سہارا نہیں تجھ سوا مرا

سب روشنی کے راز سموئے ہیں شوق سے
شعروں میں پڑھ سکو تو پڑھو مدعا مرا

لہروں سے چھیڑ چھاڑ مرا ذاتی فعل تھا
دریا کے ساتھ بنتا نہیں ہے گلہ مرا

کس دیس کا ہوں کونسی دُنیا سے آیا ہوں
کھلتا نہیں کسی پہ یہاں زائچہ مرا

اس میں رضا کی چشمِ تمنا کا ہے خمار
ہمت ہے آپ میں تو بجھاؤ دیا مرا

غزل

کبھی احساس یہ ہوا ہی نہیں
میں جہاں تھا وہاں کا تھا ہی نہیں

تیری نسبت بھی اِس زمیں سے ہے
تجھ سے مل کر کبھی لگا ہی نہیں

اُس کو توڑا تو یہ کھلا ہم پر
پسِ دیوار کوئی تھا ہی نہیں

ان کا سایا ہے سارے عالم پر
جن کا سایا، سنا ،کہ تھا ہی نہیں

یوں تو مل آئے ایک دنیا سے
جس سے ملنا تھا وہ ملا ہی نہیں

اس کی خوشبو تھی میرے بستر میں
جانے والا کہیں گیا ہی نہیں

تو بھی پیاسا ہے ایک مدت سے
میں نے محسوس یہ کیا ہی نہیں

تجھ سے مل کر نجانے کیوں یہ لگا
میں تو خود سے کبھی ملا ہی نہیں

پڑھ لیا ایک اک صحیفہ حبیب
دل پہ لکھا مگر پڑھا ہی نہیں

بشیر احمد حبیب

غزل

ساتھ مظلوم کا ، سدا دینا
یہ حمایت ، ہمارا ورثہ ہے

یہ نئی بات تو نہیں کوئی
یہ شہادت ، ہمارا ورثہ ہے

تیروں تلواروں میں بھی کرتے ہیں
یہ عبادت ، ہمارا ورثہ ہے

ہم علم دار کے قبیلے سے
یہ قیادت ، ہمارا ورثہ ہے

ہم پلاتے ہیں دودھ ،قاتل کو
یہ سخاوت ، ہمارا ورثہ ہے

سجدے میں سر کٹاتے ہیں عاصم
یہ اطاعت ، ہمارا ورثہ ہے

عاصم بخاری

غزل

یہ بھی شہکار ہے قدرت کے ہی شہکاروں میں
مسکرانے سے بھنور پڑتے ہیں رخساروں میں

اپنے ہی کام کے شیدائی تھے دنیا میں سب
کوئی مخلص نہ نظر آیا مجھے یاروں میں

وہ تو فرہاد کی چاہت کا بھرم تھا ورنہ
دودھ کی نہر کہاں ملتی ہے کہساروں میں

ہیں یہاں نقد کے گاہک کے بھی خواہش مند
کوئی تاخیر کا قائل نہ دکاں داروں میں

غور جب عالمِ تنہائی میں کرتا ہوں کبھی
اجنبی چہرے نظر آتے ہیں دیواروں میں

کوئی تحریر بھی آفت سے نہیں ہے خالی
اب خبر خیر کی ملتی نہیں اخباروں میں

شہر میں عہدِ محبت سے خیالی پہلے
نام شامل تھا ہمارا بھی سمجھ داروں میں

زبیر خیالی

غزل

پرانا زخم کوئی ٹیس دینے لگتا ہے
ہنسی ہنسی میں بھی رونے کو دل مچلتا ہے

تجھ ایسا شخص بھی سوتے میں چھوڑ جائے اگر
ہوا کواڑ بھی چھو لے تو دل لرزتا ہے

تمھاری یاد سے چلتا ہے کارخانۂ دل
تمھارا نام نہ لوں تو کہاں دھڑکتا ہے

جو سچ کہوں تو جدائی بھی ایک موسم ہے
کبھی کبھی تو بہاروں میں آ نکلتا ہے

تری تلاش کے صحرا سے اک دریدہ لباس
وفا کی لاش اٹھائے ہوئے گزرتا ہے

پھر اس کے سرد رویے پہ تم کو حیرت کیوں
جو اعتبار کے..... کے ٹوٹ پہ جا پھسلتا ہے

ذرا سی بات پہ جھٹکے سے توڑ ڈالا گیا
مرا وہ مان کہ مجھ کو وہ اب سمجھتا ہے

خالد ندیم شانی

غزل

صدا بلند ہوئی کشتیاں جلانے کی
قطار لگ گئی لوگوں کے لوٹ جانے کی

چلے گئے ہیں سبھی چھوڑ کر مفاد پرست
مجھے پڑی نہ ضرورت دیا بجھانے کی

اُسے لگا ہے مجھے کوئی غم نہیں شاید
اُسے کہو، مجھے عادت ہے مسکرانے کی

کسی بہانے چلے آؤ ہم سے ملنے تم
بڑھاؤ قدر کسی دن غریب خانے کی

مرا نصیب کہ ہر بار منہ کی کھانا پڑی
ہزار کوششیں کی ہیں تمھیں بھلانے کی

قدم زمیں پہ نہیں پڑ رہے خوشی سے مرے
سنی ہے میں نے خبر جب سے تیرے آنے کی

وہ میرا آخری کردار تھا کہانی میں
صدائیں آتی رہیں تالیاں بجانے کی

کسی کے عشق میں اکمل گزار دی ہم نے
ہماری عمر تھی جب سیکھنے سکھانے کی

اکمل حنیف

غزل

جھوٹے ہو تم کہوں میں ضرورت نہیں مجھے
ہر شخص سے لڑوں میں ضرورت نہیں مجھے

جس شخص کو نہ آؤں میں بیٹھا ہوا نظر
اسکے لیے اٹھوں میں ضرورت نہیں مجھے

تیرے مقابلے میں تری چغلیاں کروں
گندی زباں کروں میں ضرورت نہیں مجھے

یہ جانتے کہ پیار ترا دل لگی فقط
پھر بھی وفا کروں میں ضرورت نہیں مجھے

اس عشق میں ہوا ہے کوئی سرفراز بھی
خود موت سے ملوں میں ضرورت نہیں مجھے

ہوش و خرد کے ساتھ تو رہنا ہنر یہاں
کب مانگتا جنوں میں ضرورت نہیں مجھے

بحریں عروض اپنے کسی اور کو بتا
مظہر امام ہوں میں ضرورت نہیں مجھے

مظہر امام

غزل

جمالِ یار پوشیدہ نہیں ہے
ہماری آنکھ ہی بینا نہیں ہے

نہیں ہے ہر کوئی خوش بخت اتنا
سبھی کو تیرا غم ملتا نہیں ہے

سلامت ہے محبت زخم کھا کر
مرا دل ٹوٹ کر ٹوٹا نہیں ہے

میں جس کی اک جھلک کا منتظر ہوں
وہی آتا نظر آتا نہیں ہے

جو وہ سچا ہے تو اُس سے یہ پوچھو
ترا بیمار کیوں اچھا نہیں ہے

نہ گر خونِ جگر شامل ہو محسن
چراغِ آرزو جلتا نہیں ہے

میتھو محسن

غزل

اے مرے چاہنے والے تو کدھر آتا ہے
ایک جنگل سے گزر کر مرا گھر آتا ہے

یہ محبت کا جو رستہ ہے نا، اس رستے میں
وہ بلائیں ہیں کہ ڈر روح میں در آتا ہے

راستہ صدق و صفا کا ہے بڑا ہی دشوار
اتنا دشوار کہ بس منہ کو جگر آتا ہے

ہم سفر یہ جو سفر ہے نا، محبت کا ہے
کیا تمہیں دل میں اترنے کا ہنر آتا ہے؟

ہر کسی کو نہیں دکھتا کہ خدا ہے آخر
جس کو آنا ہو نظر اس کو نظر آتا ہے

درد کرتا ہے مجھے میرے خدا کے نزدیک
درد ہی سے تو دعاؤں میں اثر آتا ہے

مل بھی جائے تو نہیں ملتی مکمل فردوس
اس میں اک آدھ تو ممنوعہ شجر آتا ہے

میں بشر ہوں مجھے اس شر سے بچا لے کوئی
مجھ میں دو ایک کی نسبت سے جو شر آتا ہے

میرے دشمن کو خبر ہو کہ یہ آسان نہیں
میری دستار سے پہلے مرا سر آتا ہے

وہ مری خیر خبر رکھتا ہے گاہے گاہے
گو ذرا دیر سے آتا ہے، مگر آتا ہے

ہجر آتا ہے درختوں کو مبارک دینے
جب پرندوں کے بدن پر کوئی پر آتا ہے

باغبانوں کی خوشی دیدنی ہوتی ہے میاں
جب کسی پیڑ کی شاخوں پہ ثمر آتا ہے

علمدار حسین

غزل

اپنی تنہائی کو آباد کیا یاد کیا
دکھ میں دکھ اور بھی ایزاد کیا، یاد کیا

بھول بیٹھا کہ کوئی اور بھی ہے پہلو نشیں
جب تجھے یاد کیا، یاد کیا، یاد کیا

اک نیا درد کمایا کہ بھلاؤں ترا دکھ
اک نیا فلسفہ ایجاد کیا، یاد کیا

آپ کے بعد بھی ہونٹوں سے لگایا اک جام
دل گھٹن سے ذرا آزاد کیا یاد کیا

اور کسی کی نہ پسند آئی مجھے طرزِ سخن
آپ کی بات پہ ہی صاد کیا یاد کیا

تحفہ دے کر اُسے قائل تو نہیں کر سکتے
جس نے یہ حیلۂ امداد کیا، یاد کیا

آخری خواب کی تعبیر ہے تحریر ولی
خواب پہلا تھا جو برباد کیا، یاد کیا

شاہ روم خان ولی

غزل

اسد رضا سحر

تیور بتا رہا ہے یہ نوری جناب کا
دم گھٹ رہا ہے آنکھ میں اک آفتاب کا

اِترا رہے ہو کس لیے رونے پہ اس قدر
اک قہقہہ بنا ہے تعارف جناب کا

سوچا تھا کبریا نے ترے بارے بعد میں
پہلے ہوا ظہور زمیں پر حجاب کا

لیتا ہے روز کھلتے ہوئے جو تمہارا نام
تتلی بتا رہی ہے پتہ اُس گلاب کا

تبدیلیاں یہ ساری ہوئی ہیں تمہارے بعد
پانی بھی دے رہا ہے مزہ اب شراب کا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کھینچ کمانِ حیات نہ خالد
سانس کا تیر نکل جائے گا

غزل

سپہرِ نیلمیں کو توڑ کر باہر نکلتا ہے
وہی سلطان ہے جو اپنی قسمت خود بدلتا ہے

روپہلی روشنی اور آسماں کی بے نشاں سرحد
کوئی تنہا مسافر ہے جو گرتا ہے سنبھلتا ہے

جنوں کی تاب کاری خاکداں میں جذب ہوتی ہے
پھر اس دھرتی پہ اک آتش فشاں شعلے اگلتا ہے

متاعِ درد، خستہ خیمۂ جاں اور بے خوابی
ہماری پرورش میں زندگی کا روگ پلتا ہے

مشینی عشق میں روبوٹ کی مانند گھائل ہوں
کوئی دم زخم بھرتا ہے، کوئی دم درد ڈھلتا ہے

کھنکتی چاندنی کے نقرئی بے جسم ذروں سے
ہماری آنکھ کے پانی میں اک منظر پگھلتا ہے

عابد رضا

غزل

کوئی کسی کے ساتھ ہے کوئی کسی کے ساتھ
لیکن میں بدنصیب، کہ ہوں بے دلی کے ساتھ

تنگ آ گئی ہو مجھ سے بہت، جان کر مجھے
تھوڑی بہت خوشی بھی ہوئی ہے غمی کے ساتھ

وہ اس لیے کہ مجھ سے نہ ہو پائی خودکشی
میں جی رہا ہوں آج اگر شاعری کے ساتھ

کچھ وقت اس کے ساتھ رہا ہوں سو علم ہے
سفاک دل بھی رکھتی ہے وہ دلکشی کے ساتھ

وہ تو ہمیں نہ مل سکا لیکن خدا کا شکر
دو چار لفظ پڑھ لیے آوارگی کے ساتھ

انجم پڑھو کتاب ظفر کی گل آفتاب
ملتے نہیں ہیں پھول اگر تازگی کے ساتھ

امتیاز انجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد وہ مجھے ہنسا ہنسا کر
کچھ اور اداس کر گیا تھا

غزل

یہ دنیا والے ہمیشہ ہی بغض پالیں گے
ہمارے بعد محبت کہاں سنبھالیں گے

تمہارے بس میں نہیں ہے تو ہم کو جانے دیں
ہم اپنے زخم کا کوئی تو حل نکالیں گے

کرم خدا کا ہوا جو تو فائدہ ہو گا
ہمارے نام کو جتنا بھی وہ اچھالیں گے

وہ دسترس کو عقیدہ بنا چکا ہے فرح
ہم اس کی ضد کو کہاں تک یوں کل پہ ٹالیں گے

فرح شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دنیا فقط گماں ہے، سب کچھ درونِ جاں ہے
جاگو ضرور خالد ، آنکھیں مگر نہ کھولو

غزل

یاد کرنے میں توانائی نہیں لگتی ہے
آپ سے اتنی شناسائی نہیں لگتی ہے

اب تو وہ جا کے بھی موجود یہاں ہوتا ہے
اب تو تنہائی بھی تنہائی نہیں لگتی ہے

ان حسیں آنکھوں میں میں کیوں نہ اُتر کر دیکھوں
ان حسیں آنکھوں میں گہرائی نہیں لگتی ہے

جس میں کرنا ہو فقط ذکر بچھڑ جانے کا
اس ملاقات میں دانائی نہیں لگتی ہے

میں نے سن رکھا ہے وہ قصۂ چاہِ یوسف
مجھ کو یہ کھائی کوئی کھائی نہیں لگتی ہے

قمر بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سرگرفتوں کے لیے گھر بھی قفس ہیں خالد
ہمت، اے خیرہ سَرو! سَر نہیں دیکھے جاتے

غزل

دکھا رہا تھا جو کل گرد میں ستارے مجھے
وہ شخص ہے کہ جو اب خاک میں اتارے مجھے

ابھی اتار کے بیٹھا ہوں، ایک عمر کی گرد
ابھی سفر کے بتاؤ نہ استخارے مجھے

یہ اب کھلا ہے کہ تم دوسرے کنارے تھے
بھنور نے پھینک دیا دوسرے کنارے مجھے

خبر نہیں کہ عروج و زوال کیا شے ہے
مگر ملے ہیں اسی خاک میں ستارے مجھے

میں ایک غار شب تار سے پلٹ ایا
سو جینے دیں گے کہاں روشنی کے مارے مجھے

عجب ہی کیا تھا جو زاد سفر چراغ رکھا
پلٹ پلٹ کے یہ کیوں دیکھتے ہیں سارے مجھے

میں آسمان کی حد سے پلٹ کے آؤں گا
زمین پیار سے اک بار تو پکارے مجھے

میرے وجود میں خوں کی جگہ محبت ہے
سو کائنات کے سب لوگ ہیں پیارے مجھے

یہ سادگی ہے، کہ تسلیم کرتا جاتا ہوں
بتا رہا ہے وہ جو کچھ بھی میرے بارے مجھے

محمد نور آسی

غزل

نبیل قیصر

گر کے اٹھنا بہت ضروری ہے
پھر سنبھلنا بہت ضروری ہے

سچ اگلنا تو کوئی بات نہیں
سچ نگلنا بہت ضروری ہے

غم بھی ڈرتے ہیں پاس آنے سے
کھل کے ہنسنا بہت ضروری ہے

ملنے جلنے سے پیار بڑھتا ہے
ملنا جلنا بہت ضروری ہے

دوسروں سے ملو ملو نہ ملو
خود سے ملنا بہت ضروری ہے

لڑتے رہتے ہو دوسروں سے مگر
خود سے لڑنا بہت ضروری ہے

دکھ نے ڈیرے جما لیے ہیں یہاں
دکھ کا ٹلنا بہت ضروری ہے

حل نکلتا نہیں نبیل کوئی
حل نکلنا بہت ضروری ہے

غزل

حسن والوں کی مرے دل میں سکونت دیکھیں
دیکھنے والے فقط مجھ میں محبت دیکھیں

سبز رنگت کی حیاؤں کے امیں، بسم اللہ
باغ میں آئیں کبھی پیڑ کی عزت دیکھیں

گردشِ وقت کا مارا ہوں بھکاری تو نہیں
کاسہ ہاتھوں میں نہیں آپ ضرورت دیکھیں

کس کو انکار کہ بیماری میں جھڑتے ہیں گناہ
دشتِ غربت میں نہ بندے یہ اذیت دیکھیں

عزتِ نفس کا ہو پاس زیادہ جن کو
بات کرنے سے کہیں پہلے طبیعت دیکھیں

لکھنے والے سے شناسائی نہیں ہے لیکن
آفریں یوں ہے لبوں پر کہ عبارت دیکھیں

بات کرنے کے سلیقے سے مرا کام بنا
اور اخلاق کی پھر خیر سے برکت دیکھیں

زیست کرنی ہو جنھیں اپنے زمانے میں قمر
وہ روایت کبھی دیکھیں کبھی جدت دیکھیں

قمر نیاز

غزل

یہ جانتے ہیں کہ جتنے دن ہیں خدا کے دن ہیں
مگر جو ہر سُو طویل ہوتے دبا کے دن ہیں

کوئی بتائے یہ پتھروں کے مجسموں کو
یہ آدمی سے لحاظ و اُنس و وفا کے دن ہیں

یہ کیسا احساسِ جُرم روحوں میں پَل رہا ہے
کوئی بتائے کہ ہم پہ کیسی سزا کے دن ہیں

جوان و طفل و بزرگ محبوس مر رہے ہیں
عجیب بے مہر و بے مروّت ہوا کے دن ہیں

ہمارے انفاس میں تعفّن بکھر رہا ہے
یہ لگ رہا ہے ہماری مرگِ اَنا کے دن ہیں

عمران ہاشمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یُوں لاقاتیں ادھوری چھوڑ کر جاتے نہ تھے
تم تو میری دُکھ بھری باتوں سے اکتاتے نہ تھے

غزل

عشق کی واردات باندھے ہیں
ہم ہیں جو مشکلات باندھے ہیں

ہجر جھیلا بڑی روانی سے
درد رکھے ہیں گھات باندھے ہیں

خوف جاتا رہا ہے مرنے کا
میں نے وحشت کے ہاتھ باندھے ہیں

دن ہوا تو بکھر گئے سارے
خواب جتنے بھی رات باندھے ہیں

منہ میں میرے بھی ہے زبان مگر
عشق نے میرے ہاتھ باندھے ہیں

جانے کب اور کہاں بچھڑ جائیں
گھر سے رستے تو ساتھ باندھے ہیں

امجد خان تجوانہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ عہد ایک مسیحا نفس میں زندہ تھا
رہا نہ وہ بھی سلامت ، بکھر گئے ہم بھی

غزل

وہ قصہ گو کے حرف زبانی تمام شُد
کیا ہونٹ سِل گئے یا کہانی تمام شُد

لیلیٰ کی زلف کو بھی سفیدی نے آ لیا
صحرا میں قیس کی بھی جوانی تمام شُد

کیوں آفتاب ہجر کا ہوتا ہے پھر طلوع
کیا وصل کی وہ رات سہانی تمام شُد

تھی اِس جہاں میں خانہ بدوشی مرے سبب
اب بعد میرے نقل مکانی تمام شُد

جس کو کبھی تھا وصل کی لذت میں رکھ دیا
اب ہجر میں غزل وہ پرانی تمام شُد

مہدی سبھی میں چاک گریباں کے سی گیا
جو عشق کی بچی تھی نشانی تمام شُد

غضنفر مہدی

غزلیں

دل کے بت خانے میں اک ایسا صنم رکھا ہے
جس نے ہر بار مرے حصے میں غم رکھا ہے

خود کو ظاہر بھی کیا اور چھپایا بھی سہی
خود کو معمار نے ہر چیز میں ضم رکھا ہے

یہ بھی گریے کی طلب گار ہے، آنکھیں دو اِسے
دل کی دیوار کی بنیاد میں نم رکھا ہے

کچھ تو ہمت نہ کی میں نے بھی کہ اظہار کروں
اور کچھ تم نے بھی جذبات کو کم رکھا ہے

اسیر حیدر

اجنبی بن کے کوئی دل سے اُتر جاتا ہے
پیار جیسا بھی ہو اک روز یہ مر جاتا ہے

تو فقط دل کے چلے جانے پہ افسردہ ہے
یاں تو بسمل کی طرح پیار میں سر جاتا ہے

مجھ کو فردوس میں تو اور بھی رکھ سکتا تھا
غلطیاں ہوتی ہیں انسان سدھر جاتا ہے

دل کی اُجڑی ہوئی بستی کو بسانے والے
چھوڑ کر شہر مرا اب تو کدھر جاتا ہے

شہزاد ساقی گل

غزل

ستم گر دھڑکنوں میں وحشتیں، لگی ہوئی ہیں
عجب سی اُلجھنوں میں حسرتیں، لگی ہوئی ہیں

چراغِ زندگی پہرے میں اب ہے تیرگی کے
یہاں تو روشنی میں ظلمتیں، لگی ہوئی ہیں

لئے ہیں خواب ان کے، نیند سے خالی ہیں آنکھیں
ہیں جتنی دل میں زندہ خواہشیں، لگی ہوئی ہیں

کوئی سمجھائے ان کو راستے بھی منتظر ہیں
یہاں تو دوریوں میں قربتیں لگی ہوئی ہیں

ہمیشہ زندگی نے، فاصلے رکھے ہیں دل میں
یوں دل کی وسعتوں میں، چاہتیں لگی ہوئی ہیں

ترے بے رحم تیور، میرا ہر سکھ چھین لیں گے
محبت کے سفر میں الجھنیں لگی ہوئی ہیں

جسے بھی زین چاہا دور جا کر چھپ گیا وہ
مرے حصے کی، کس جا چاہتیں لگی ہوئی ہیں

عبدالرؤف زین

غزل

یہ تازگی سی رگ و پے میں جو سمائی ہے
ترے پسینے میں پہروں نہا کے آئی ہے

میں کیسے اپنے سمندر سمیٹ لوں جب کہ
ہر ایک موج میں طوفانِ خود نمائی ہے

بلا کی ٹھنڈ میں کس سے حساب مانگو گے
کہاں سے آگ چرائی.... کہاں جلائی ہے

کسی خوشی کو فضیلت نہیں غمِ دل پر
یہ روشنی مرے سینے میں انتہائی ہے

تراش لے گا تری روح کے نشاں اک دن
یہ لمس شوق کا ہے اور مادرائی ہے

ابھی سے آنکھ میں سرخی، جنون اور وحشت؟
ابھی تو بات بھی ہم نے نہیں بڑھائی ہے

اُسے خبر ہی کہاں تھی وجود میں اُس کے
کہاں تلک مرا حصہ، مری رسائی ہے

چلو کہ جھاڑ لیے جائیں ہاتھ دنیا سے
یہ خاک ہم نے بہت دیر تک اڑائی ہے

سواد اُس کا نہ بھولے گا یہ جہاں نینا
جو دیگ تو نے فقط خواب میں پکائی ہے

نینا عادل

غزل

عظمیٰ نقوی

عشق کی واردات پھیل گئی
بَن میں خوشبو کی بات پھیل گئی

دیر سے رُوبرو تھے فتح و شکست
چُھپ گئی فتح، مات پھیل گئی

ڈھال دن بھر بنا رہا خورشید
تھک کے بیٹھا تو رات پھیل گئی

چاند نکلا تو تیرگی سمٹی
چاند ڈوبا تو رات پھیل گئی

جو کبھی ایک جست تھی عظمیٰ
جانے کب کائنات پھیل گئی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے مرے افکار کی پس ماندگی
اک زمانہ انقلابی ہو گیا

غزل

آرزو کب ہوئی آزار پتہ ہی نہ چلا
کیسے ہم ہو گئے مسمار پتہ ہی نہ چلا

تجھ سے ہی ترکِ محبت کی کہانی سن کر
کب ہوئے تیرے طلبگار، پتہ ہی نہ چلا

ایک پگڈنڈی ہمیں ساتھ لیے پھرتی رہی
کس طرح دشت ہوا پار، پتہ ہی نہ چلا

ایک آواز نے کی سمت نمائی ایسے
ہو گئے ہم بھی گرفتار پتہ ہی نہ چلا

وہ تو اچھا ہوا سر پھوٹ گیا جلدی میں
بن گئے آپ بھی دیوار، پتہ ہی نہ چلا

پہلے توحید گئی جبہ و دستار گئے
ساتھ چلتے رہے بدکار، پتہ ہی نہ چلا

میں اپنی دھن میں لکھے جا رہا تھا ہجر وصال
سر پہ تھی موت کی تلوار پتہ ہی نہ چلا

اعجاز رضوی

Yame

سید تحسین گیلانی

ڈاکٹر سائمن---، جاپانی اور چائنیز کے ساتھ مل کر ایک ایسے روبورٹ پر کام کر رہے تھے جو انسانی feelings کے ساتھ کام کر سکے جیسے کہ محبت مشین کے بس کا کام نہیں، خوشی اور غم کیا ہوتا ہے یہ ایک مشین کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے لیکن ڈاکٹر سائمن پچھلے سات سالوں سے ''ربورٹ یو'' پر اسی حوالے سے کام میں مصروف تھے۔ اس سے پہلے ''یو'' نے سائنسدانوں کے ساتھ مل کر کئی اہم مشن پر جوائنٹ وینچر کیا تھا جیسا کہ مریخ پر کھدائی کا کام اور وہاں پانی کی تلاش کے منصوبوں پر عمدگی سے ''یو'' نے کام سرانجام دیئے تھے۔ مریخ پر سب طویل عرصہ وقت گزارنے کا عالمی ریکارڈ بھی ''ربورٹ یو'' کے پاس تھا۔ یو کو چاند کی قدم بوسی کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ اس وقت یو ایک مشہور ربورٹ بن چکا تھا۔ اس بار اسے لڑکی بنا کر انسانوں میں چھوڑنے کا تجربہ کرنے کی تیاری کی جا رہی تھی اس کی پروگرامنگ میں ایک بچی ایک لڑکی ایک عورت کی تمام تر فیلنگز کا feeding process آخری مراحل میں تھا۔ ڈاکٹر سائمن۔ ڈاکٹر چنگ می اور ڈاکٹر نا کی مورات بھر ایک عورت کی فیلنگز پر گفتگو کرتے رہے۔

ڈاکٹر سائمن نے ہنستے ہوئے کہا بھئی دیکھتے ہیں مردوں کی دی ہوئی عورت کی فیلنگز کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔ ایک پریشان کن قہقہہ تینوں کی جانب سے اچھلا ہے۔ ڈاکٹر نا کی موکہتے ہیں اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر لینا from Italy کو اس کام کے لیے منتخب کرنا مناسب ہوگا۔ وسکی کا گلاس سائیڈ پر رکھتے ہوئے ڈاکٹر سائمن نے دو منٹ آنکھیں بند کیں اور بولے آپ ٹھیک کہتے ہیں نا کی مو۔ اگلی صبح فلائٹ سے ڈاکٹر لینا چائنیز ربوٹک ریسرچ سینٹر پہنچ گئیں۔ وہ اپنے طور اس پروجیکٹ پر کام کر رہی تھیں اس لیے اُن کا کام تیار تھا چاروں نے ساری رات وفا/ خلوص/ محبت/ جنون/ عشق/ لاعشق اور نسایت کے فیڈنگ پروگرامنگ پروسس پر کام کیا۔ فائنلی "یو" کو ایک خوبرو حسینا کا ماسک پہنایا گیا یہ چائنیز حسینہ کیا غضب کی لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر سائمن اس کی تیاری کے بعد خود اپنی تخلیق پر فدا ہو گیا تھا۔ وہ سب اسے دیکھ کر مبہوت تھے۔ اسے آن کر کے سامنے بٹھایا گیا تو ڈاکٹر سائمن نے شرارت بھری آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔ تو وہ بولی:

ہائے ڈاکٹر

its me your Creation `You. But from now i have a new name Yume.

Do you like it?

ڈاکٹر سائمن اور دیگر نے اس نام کو پسند کیا۔ بطور تجربہ اسے ایک سال تک خوبصورت لڑکی کے روپ میں مختلف ممالک میں

for human behaviour observation

کے لیے رکھا گیا۔ ایک سال بعد اسے واپس بلایا گیا اور پوری ٹیم کو سامنے بٹھا کر جب اس سے پوچھا گیا۔ تم نے انسانوں کو کیسا پایا؟؟

تو Yume نے بس اتنا کہا۔

I am a machine and I love to be a machine. I felt there is no love left in human specially in men, they are just living in this world for sex. I can not cry But I had been felt lost in that world ,sorry I quit.

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پاور بٹن سوئچ آف کر دیا۔

☆☆☆☆☆

.....مسٹر جان..... (مائیکرو فکشن)

"Sir why that little Sparrow is always around you."

سر جان کے شاگرد اسٹن نے پوچھا

ہاہاہا۔ کیونکہ یہ جانتی ہے:

"now gold is old."

کیا مطلب سر:

چھوڑو تم بتاؤ کتنا کام باقی ہے پروجیکٹ 9 پر:

جی سر پارٹس ریڈی ہیں:

Just we need a rat to fix the parts.

"دیکھو میں امریکی انٹیلی جنس کا حصہ ہوں اور میں اور تم ہر وقت کسی نہ کسی نظر میں رہتے ہیں آج ٹیکنالوجی حیران کن ہے سائی بورگ سپائر نے حکومتوں کے کاموں کو مزید آسان بنا دیا ہے جیسا کہ امریکی اپنے کام میں ماہر مانے جاتے ہیں ویسے ہی جاپانی روسی جرمن اور چائنیز بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ you know ہم کولڈ وار کے زمانے میں جی رہے ہیں۔ آج ممالک معیشت کی جنگ میں مصروف ہیں ایسے میں ہمارا کام کرنا مزید مشکل ہو جاتا ہے۔"

"جی بالکل سر۔ معلوم ہوا ہے کہ دو روسی سائنسدان چند روز پہلے گھر میں مردہ پائے گئے۔"

سر جان نے قہقہہ بلند کیا!!

"یہ تو ہوتا ہے--

everything is fair in love and war."

"do you remember that Spy snake experiment.

"اوہ کے سر میں تو بھول ہی گیا تھا۔ واؤ۔!!"

"لیکن سر اس جیت کا جشن اپنی جگہ لیکن کیا یہ جنگیں انسان کو سکون دے سکتی ہیں۔؟ اب تو حد ہی ہو گئی یعنی ہم نے تو جانوروں پرندوں اور حشرات کو بھی قاتل بنا دیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" لیکن یاد رکھو اس وقت دنیا میں جنگل کا قانون رائج ہے یہاں زندہ رہنا ہے تو دشمن سے طاقتور ہونا پڑے گا ورنہ بڑا جانور تمھیں نگل جائے گا۔ سفاک نہیں بنو گے تو مارے جاؤ گے۔"

" Now you go and orde an eagle to catch that sparrow."

ورنہ مرنے کے لیے تیار رہو۔

☆☆☆☆☆

سیّدہ آیت گیلانی

......علی گوہر کا اے ایل آئی......(علی)! [مائیکرو فکشن]

میرا نام علی گوہر ہے اور میں ----، جرمنی میں اپنے بابا کے ساتھ رہتا ہوں۔ جس حقیقت سے آج بابا نے مجھے آگاہ کیا ہے وہ کسی معمے سے کم نہیں۔ پاکستان --- گائنی کالوجسٹ --- مریض -- اور نہ جانے کیا۔ لگتا ہے بابا کی باتیں اچھی طرح سمجھے بغیر ذہن میں نہیں بٹھا سکوں گا۔ کیونکہ دور پار کے رشتوں کی طرح یہ گتھی بھی خاصے الجھاؤ کی حامل ہے--- ایک ترتیب کے ساتھ چلتا ہوں---

بابا--- میرے بابا پاکستان میں ایک گائنی کالوجسٹ تھے، ٹھیک ہو گیا--- امرا میں مشہور بھی تھے کیونکہ اچھی سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔

میری ما--- کیا بتایا بابا نے--- ہاں! ما بھی ڈاکٹر تھیں اور الٹراساؤنڈ والی--- مطلب ریڈیالوجسٹ تھیں---

آگے کافی گنجلک کہانی ہے--- یعنی بابا کے بقول،

"میں ایسی ریسرچ کا منصوبہ بنائے ہوئے تھا کہ جس سے میری شہرت پوری دنیا میں ہو سکتی تھی۔ اس دور میں اعضا کی پیوندکاری پر کام ہو رہا تھا۔ پیوند ہونے والے اعضا چونکہ جسم کے لیے اجنبی ہوتے ہیں اس لیے نئے عضو کی بقا کے لیے جسم کے مدافعتی نظام کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ ماں کے پیٹ میں پلنے والا بچہ اجنبی ہونے کے باوجود زندہ رہتا ہے اور میں پورے انسان کی پیوندکاری کا تجربہ کرنے لگا تھا۔ وہ خاتون، جس کے جڑواں بچے تھے--- میں نے ایک اٹھا لیا اور تمہاری ما حاملہ ہو گئیں---"

بہر حال، میں پیدا ہوا تو ما اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئیں اور بابا میرے ساتھ، سب کچھ چھوڑ کر جرمنی چلے آئے۔ انکل لیموئیل، 'ماہر روبوٹکس' کے اصرار پر بابا ان کے ساتھ کمپیوٹر اور آرٹیفیشل انٹیلی جنس یعنی مصنوعی ذہانت پر کام کرنے لگے۔

اب میں اٹھارہ سال کا ہو چکا ہوں تو میری یادداشت اور میرے مزاج پر بابا نے انکل لیموئیل کی مدد سے ایک روبوٹ بنایا ہے جو بالکل میرے جیسا بننے والا ہے، ہو بہو علی گوہر۔ شاید بابا میرے جڑواں بھائی کو مصنوعی ذہانت کے ذریعے زندگی دے رہے ہیں۔ کیونکہ میرے دوسرے بھائی کے بارے میں انھیں کوئی علم نہیں کہ پاکستان میں اس کا کیا ہوا، کیا بنا اور وہ کہاں، کس حال میں ہے۔ ہاں 'مصنوعی ذہانت' والا میرا بھائی، جس کا نام "علی" رکھا گیا ہے، ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ کمپیوٹر میں بھی، موبائل میں بھی اور وقت کے روبوٹ کی شکل میں بھی۔ اب انکل لیموئیل، علی کو انسانی روپ دینے والے ہیں۔ ایسا انسانی روپ کہ وہ بالکل میری شکل و صورت و جسامت کا حامل ہو جائے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کو میری یادداشت و جذبات بھی دے دیے گئے ہیں۔ شاید وہ میرے اصلی بھائی سے بھی زیادہ میرا جڑواں اور کامل ہو گا۔ تو اپنے بارے میں ایک بار پھر بتا دوں کہ میرا نام علی گوہر ہے--- نہیں--- میں صرف علی ہوں۔--- اے ایل آئی، آرٹیفیشل لونگ انٹیلی جنس--- مصنوعی (مگر) زندہ ذہانت--- جذبات و احساسات کی حامل مصنوعی زندہ ذہانت، یعنی علی--- اے ایل آئی۔

☆☆☆☆☆

حامد حسن

کبوتر اور سانپ [مائیکرو فکشن]

گلی سے بانسری کی دردناک آواز سنتے ہی اس کے سمندر دل میں ارتعاش پیدا ہوا۔ دماغ میں جذبات کی لہریں اٹھنے لگیں اور پاؤں سنامی کی رفتار سے گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے بانسری بجانے والے کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔ پیر دانا پتھر پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے پرسکون انداز سے بانسری بجا رہا تھا۔ اس کے کاندھے پر خوبصورت کبوتر بیٹھا تھا۔ بانسری کے اداس سر نوجوان کے دل میں اتر رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بانسری اس شہر بدحواس کا مرثیہ سنا رہی ہے۔ بانسری کی آواز دھیرے دھیرے دھیمی ہونے لگی۔ مرثیہ ختم ہونے کے بعد پیر دانا نے اپنی روشن آنکھیں کھولیں۔ نوجوان کے کانوں میں ابھی بھی بانسری کی آواز گونج رہی تھی۔ نوجوان کے شکیل چہرے کو دیکھ کر پیر دانا کے ہونٹوں پر تبسم پھیلا اور اس کے ملائم لہجے نے نوجوان کو اپنی طرف متوجہ کیا:

"اے خوب رو نوجوان! آپ کی جوان سوچ کس طوفان میں پھنس چکی ہے جو آنکھیں بند کر کے ساحل کی تلاش میں سرگرداں نظر آرہے ہو۔ تمہاری جھیل سی آنکھوں میں یہ ویراں جزیرہ کیوں دکھائی دیتا ہے۔"

پیر دانا کے ملائم لہجے کی ٹھنڈک نوجوان کے دل کو راحت پہنچا گئی اور اس کے گلابی لہجے سے شہد بھری شکایت در آئی:

"اے بانسری کے سر میں اس شہر بدحواس کا مرثیہ سنانے والے پیر دانا---! اس بدحواسی کی کیا وجہ ہے۔؟"

اس قسم کا سوال پیر دانا کے سامنے کسی نے پہلی بار رکھا۔ وہ اطمینان کی سانس لیتے ہوئے سوچنے لگے کہ برسوں سے بانسری بجانے کا نتیجہ آج سامنے آیا۔ ایک سرد آہ لیتے ہوئے وہ گویا ہوئے:

"انسانوں کے دماغوں میں نفرت کے سانپ رینگ رہے ہیں اور دل انسانیت کی زرخیز مٹی سے خالی ہو کر پتھر بن چکے ہیں۔ اب یہ بدحواس ہو کر زندگی کی دوڑ میں دوڑے جا رہے ہیں۔"

نوجوان یہ خوفناک راز سن کر پوچھ بیٹھا:

"شہر کی اس بدحواسی کا اب کیا علاج ہے؟"

"بس--- دماغ سے نفرت کے سانپوں کو نکال کر دل میں محبت کے کبوتر بسا دو۔"

یہ کہہ کر پیر دانا پتھر سے اٹھ کر بانسری بجاتے بجاتے چل دیا اور نوجوان کی ویراں آنکھیں پتھر کے نیچے سے سانپوں کو نکلتے ہوئے دیکھ کر چمک اٹھیں، کیونکہ اب پتھر کے اوپر سفید کبوتر بیٹھا تھا۔

☆☆☆☆☆

ریاض توحیدی کشمیری

شکن [مائیکرو ف]

اس کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں آتی تھی چاہے جیسے بھی حالات ہوں۔ بھلے اس کے تحت الشعور میں مسائل کا انبار کروٹیں لے رہا ہوتا یا الجھنوں کے انبوہ کثیر نے اسے چاروں طرف سے گھیرا ہوتا، وہ ہر تکلیف دہ بات کو پاؤں کے ٹھڈے سے پرے دے مارتا اور مسکرا کر کنی کترا جاتا۔

لیکن اس بار وہ خود کو نہیں بچا پایا تھا۔ بے شک رزق دینے والی ذات کوئی اور تھی لیکن وسیلہ تو اس ذات نے انسان کو ہی بنایا ہوا ہے۔ کسی اور کی غلطی کی وجہ سے فراست کی نوکری خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ساری دنیا کے تیر اندازوں نے اسے اپنے نشانے پر رکھ دیا ہے۔ سمندر کی بپھری ہوئی ہر لہر چودھویں چاند کی کشش کی وجہ سے گھوم پھر کر اسے ہی اپنی اور کھینچے جا رہی ہے۔ ہوا کے بگولے اور سارے بھنور گویا اسے اٹھا اٹھا کر پٹخنے کو تیار بیٹھے ہیں۔

جس کرب سے وہ گزر رہا تھا، اس سے وہی واقف تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی سینئر اسے روزانہ بلا کر پہلے اس کی شرافت کے قصیدے طنزیہ انداز میں پڑھتا اور پھر اس پر کسی اور کی کی گئی کرپشن کا ذکر چھیڑ کر الزام مکمل کر دیتا۔

"بس اتنی سے شرافت تھی؟"

"ایمانداری کا ڈھونگ رچا کر سارے دفتر کو بے وقوف بنایا ہوا تھا۔"

اس طرح کے بیسیوں جملے اسے سننے پڑتے تھے۔ وہ ماتھے پر کئی شکنیں ڈالے صرف اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے اسے سینئرز کی بکواس اور ساتھیوں کی کڑوی نظروں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

چار دن بعد وہ اپنے ادارے کے ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔

"تجمل صاحب! یہ رہی یو ایس بی جس میں میری تکلیف کے خاتمے کا اور قصور وار کون ہے، اس کا ثبوت موجود ہے، جسے دنیا کی کوئی عدالت نہیں جھٹلا سکتی۔"

پھر فراست نے ایک اور کاغذ ان کے سامنے رکھا۔

"یہ رہا عدالتی دعوت نامہ جس کی رو سے میں نے آپ کی کمپنی پر ہتک عزت کا دعویٰ کیا ہے اور ذہنی تکلیف پہنچانے اور میرے عزت اچھالنے کے ہرجانے کے طور پر ایک کروڑ روپے کا مطالبہ کیا ہے۔"

ڈائریکٹر صاحب فراست کو ٹکر ٹکر دیکھے جا رہے تھے اور ماتھے پر آئے پسینہ صاف کرتے جا رہے تھے۔

"یہ رہا میرا استعفیٰ۔ رب نے مجھے میرے صبر کے صلے میں اس سے بہتر نوکری سے نوازا ہے۔ میرے بقایا جات جلدی ادائیگی کے احکامات جاری کر دیجیے گا۔" اس نے ایک اور کاغذ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ اب کس بات کی جلدی ہے؟" ڈائریکٹر نے اپنی افسری جھاڑنے کی کوشش کی۔

"اس لیے تجمل صاحب کہ عدالت سے سزا سے آپ قطعی نہیں بچ سکیں گے۔" فراست نے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اس کے ماتھے کی ہر شکن دور ہو چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

ابنِ نیاز

سائیں بابا

حنیف باوا

گھریلو حالات سے بے زار ہو کر اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کے ہاں آیا ہُوا تھا۔ اُس کی رہائش کریم آباد کالونی میں تھی۔ کہتے ہیں کہ بیٹیاں پھول ہوتی ہیں۔ واقعی میری یہ چھوٹی بیٹی پھول ہی ہے۔ اُس کے ہر سانس سے محبت اور پیار کی خوشبو برآمد رہتی ہے۔ میرا داماد بھی بہت اچھا ہے میرے یہ دونوں پیارے میرا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ اُن کے گھر کے جنوب کی طرف ایک بابا سائیں رہتا تھا۔ جو خود کو درویش بھی کہلاتا تھا۔ اُس کے ماننے والے اُس کی ہر ایسی بات کو درست سمجھتے تھے۔ جب وہ اُس کے درشن کے لیے آئے تو وہ نقدی کی صورت میں اُسے نذرانہ پیش کرتے وہ اُنھیں خوشی سے قبول کرتے ہوئے جلدی سے اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ اُس کے سر کے بال جو ہمیشہ سرسوں کے تیل سے چپڑے رہتے ہمیشہ دونوں کندھوں پر بکھرے رہتے۔ اُس کی داڑھی سدا بے ترتیب ہی رہتی اُس کی گردن کے گرد ہر وقت ایک سرخ رنگ کا پٹکا لٹکا رہتا۔ جسے وہ دن میں جھاڑ پھونک کر رکھتا۔ اُس کی یہ تمام صورتیں کبھی کبھار اُس کے سائیں بابا ہونے کا شائبہ پیدا کرتی رہتی اور اُس کا آستانہ جدید طرز کے تعمیر شدہ

مکانوں کی طرح خوبصورت اور نفیس تھا۔
کبھی کبھار اُس کے آستانے کے گیراج میں ایک خوبصورت سی کار بھی کھڑی دکھائی دیتی جسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اُسے کہیں لے جانے کے انتظار میں ہو۔
اکثر عورتیں جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی وہ اُس سے اولاد مانگنے آتیں۔ تو وہ انھیں اولاد دینے والے اُن تعویزوں میں سے جو پہلے سے تیار شدہ ہوتے دیتا۔ سائیں بابا ایک ایک کر کے تعویز نکالتا اور اُن عورتوں کے حوالے کر دیتا عورتیں وہ تعویز لیتی جاتیں اور ان کے بدلے میں سائیں بابا کی مٹھی گرم کرتی جاتیں۔ وہ تعویز انھیں اولاد سے نوازتے تھے۔ اُس کے بارے میں وہ عورتیں ہی بہتر جانتی یا پھر خدا۔
ایک بات سائیں بابا کے بارے میں مشہور تھی کہ وہ آگ سے بہت ڈرتے تھے۔
چاہے وہ آگ جہنم کی آگ ہو یا چولہے سے نکلتے ہوئے انگاروں کی آگ جہنم کی آگ کا تو حشر کے روز ہی پتا چلے گا، لیکن سائیں جی چولہے کی آگ سے آج تک بچتے چلے آرہے تھے۔
آگ سے ڈرنے والے میں سائیں بابا سے جب کوئی اپنی مرادیں مانگنے آتے تو پہلے وہ اپنے جوتے سائیں کے آستانے کی دہلیز پر کھولتے پھر آستانے کے اندر جاتے لیکن جب وہ سائیں کی چارپائی، جس پر بیٹھے ہوتے کو دیکھتے تو سائیں کے جوتے اُس کی چارپائی کے پاس کھلے ہوتے میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہونا ہی چاہیے اس لیے کہ کہاں سائیں کے جوتے اور کہاں عام لوگوں کے جوتے۔
سائیں بابا ہر سال اپنا عرس جسے اُس نے میلے کا نام دیا ہوا تھا ربیع الاول کی پانچ تاریخ کو منایا کرتے تو اُس روز اُس کے مریدین کافی تعداد میں جمع ہوتے جن کے اکثر کے کندھوں پر سرخ رنگ کا دوپٹہ لہرا رہا ہوتا۔ میلے کی شروعات ڈھولوں کی تھاپ پر گھوڑوں کے خوبصورت ڈانس سے ہوتی۔ یہ ڈانس گلی کی آخری نکر تک جاری رہتا پھر وہاں سے واپس سائیں آستانے پر آ کر تھم جاتا۔ اس تقریب کے دوران سائیں کے مرید اُن پر روپوؤں کی گڈیاں وار کر گھوڑوں کے مالکوں کو دیتے جاتے۔ اس کے بعد قوالی کا دور شروع ہوتا جو تقریباً دو گھنٹے جاری رہتا۔
قوال اپنے سازوں کی مٹھی دھنوں کے ساتھ خوبصورت سُر بکھیرتے جاتے اس طرح جب قوالوں کی جھولیاں روپوؤں سے بھر جاتیں تو یہ پروگرام اختتام پزیر ہو جاتا۔ پھر لنگر ہوتا جس سے لوگ اس کے لذیذ کھانوں سے شکم پروری کرتے یوں یہ

سلسلہ سورج کے ڈوبنے تک جاری رہتا۔
سائیں بابا کے اُس میلے کے دنوں میں بھی میں اپنی بیٹی کے ہاں گیا ہوا تھا یہ میلے کے ایک روز پہلے کی بات ہے شام کا وقت تھا کہ اچانک سائیں بابا اپنے آستانے سے باہر نکلے اُس کے ساتھ ایک مرید تھا۔ مرید آگے تھا اور سائیں اُس کے پیچھے سائیں کے آستانے کے سامنے والی سڑک کے دوسرے کنارے سے ذرا ہٹ کر ایک پہاڑی کیکر کا درخت تھا۔ سائیں بابے کے اشارے سے اُس کا مرید اس کیکر کے پاس جا کر رُک گیا اُس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جس کے ایک سرے پر ایک چیتھڑا سا لپٹا ہوا تھا جس پر سے آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ سائیں نے پھر اس کی ایک ٹہنی کی طرف اشارہ کیا۔ مرید نے اُس اشارے پر ٹہنی کو آگ دکھائی تو پتا چلا کہ وہاں بھڑوں کا ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں اُن کے بچے پل رہے تھے۔ وہ ایسے کہ اُن کے مائی باپ اُن کے لیے باہر سے خوراک لاتے اور انھیں کھلاتے لیکن ابھی وہ پرواز کے قابل نہیں ہوئے تھے کہ پیر کے مرید کی آگ نے انھیں جھلسا کر نیچے گرانا شروع کر دیا۔ اب جب کہ وہاں پر موجود بھڑ آگ کی نذر ہو گئے اور اُن کا گھر نیچے آ گرا تو سائیں چہرے پر مسکراہٹ پھیلا کر بولا

"اب ٹھیک ہو گیا ہے سب کچھ"
اب ہمارے میلے کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔
دوسرے روز دن کے تیسرے پہر میلہ شروع ہو گیا۔ پہلے ڈھول کی تھاپ پر گھوڑوں کا ناچ ہوا۔ پر قوالی کے پُر سرود سروں کے بعد لنگر تقسیم ہوا جب میلے کے شرکا نے خوب پیٹ بھر کر کھایا لیکن اُس میلے میں کسی نے بھی اُن جھلسے ہوئے بھڑوں کی جانب نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا جہاں ہر چند بھڑ جو اپنے بچوں کے لیے خوراک لینے گئے ہوئے تھے جو میلے کے اختتام سے کچھ دیر پہلے لوٹے تھے۔ اور اب وہ اپنے جلے ہوئے گھر کے پاس بیٹھے اپنے اُن بچوں کو تلاش کر رہے تھے جنھیں سائیں بابا کی آگ نے جلا کر رکھ دیا تھا۔ اب اُن بھڑوں کے چہروں پر چھائی ہوئی افسردگی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا جیسے وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے ہوں۔
سائیں جی آپ کو آپ کا میلہ مبارک ہو لیکن ہم تو یہ پوچھتے ہیں کہ ہم تو پُرامن رہ کر اپنے بچوں کو پال پوس رہے تھے تو پھر آپ نے ہمارے معصوم بچوں اور ہمیں آگ کے حوالے کیوں کیا۔
آخر آپ نے ایسا کیوں کیا۔ آپ تو جگ کے سائیں بابا کہلاتے تھے۔

☆☆☆☆☆

تکمیل کی قے

دامن کوہ میں اوپر پہاڑی پر بنے ہوٹل کے باہر وسیع احاطے میں کرسی پر بیٹھ کر سردی سے ٹھٹھرے نیلے آسمان اور سفید بادلوں کو چائے کی چسکیوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ دائیں طرف چند قدموں کی دوری پر لوہے کا جنگلہ تھا جس سے نیچے کی بل کھاتی وہ سڑک دکھائی دیتی تھی جس سے لوگ پیدل چل کر یا گاڑی سے گھوم کر یہاں اوپر ہوٹل تک آتے تھے۔

یہ سارا منظر اتنا پیارا تھا کہ میرا مڈل سکول کلاس دل بھی رومانیت کے احساس سے بھر گیا، جس کے باعث ہر چیز خوبصورت لگ رہی تھی۔ یقیناً انسانی نفسیات پر موسموں کے اثرات ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے مغرب کے لوگ خوبصورت دکھتے ہیں۔ ان کے لباس سے لے کر سڑک تک، اور چہروں سے لے کر رویوں تک سب میں ایک طرح کا اجلا پن ہوتا ہے۔ ایسے موسم میں وہ بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں، اسی لیے وہ اتنی ترقی کر گئے ہیں۔ یہاں البتہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انتہائی گرمی میں لوگوں کی روح سے لے کر جذبات تک بھڑکے ہوتے ہیں اور معمولی معمولی باتوں پر لڑ پڑتے ہیں۔ ان کے لباس سے لے کر چہرے تک مایوسی اور ناامیدی کی بوسیدگی ٹپک رہی ہوتی ہے، ان کے پاس کوئی مقصد کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ اور اگر موسم اچھا ہو جائے تو آپے سے باہر ہو کر چھچھورے پن پر اتر آتے ہیں۔ ہر بات میں انگریزوں کی نقل کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ لیکن مغربی دنیا میں خوبصورتی کے علاوہ مادر پدر آزادی کا ایک نقصان وہ رجحان بھی ہے، جس کی نقل یہاں بھی ہونے لگی ہے۔ لڑکیاں اچھے بھلے سیاہ بالوں کو سنہرا کر کے عجب جعلی سا تاثر دیتی ہیں۔ لڑکے انگریزوں کی نقل میں ایسا لباس پہننے لگے ہیں جو ہماری تہذیب سے میل نہیں کھاتا اور دور ہی سے الگ مخلوق نظر آنے ہیں۔ اور خود کو ہیرو تصور کر کے آتی جاتی لڑکیوں کو چھیڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

میرا آوارہ ذہن عجب ہی باتیں سوچ رہا تھا۔

اعجاز روشن

لیکن یہ سچ ہے کہ موسم سہانا ہو تو دل بیچارہ خوش ہو کر کئی طرح کی چاہتیں اور خواہشیں پالتا ہے۔ میرے دل نے بھی موسم کے زیر اثر کسی چاند چہرہ ساتھی کی خواہش کی جو اس موسم کا لطف دوبالا کر دے اور عین اسی وقت کسی نے بیٹھنے کی اجازت چاہی اور پھر خود ہی میز کی دوسری طرف لوہے کی کرسی پر بیٹھ بھی گیا۔

وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھی اس کے ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ تھا - میں اس کے حلیے اور بے باکی سے کچھ گھبرا کر کچھ شرما کر جنگلے سے نیچے بل کھاتی سڑک کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی شاید ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔

یہ یقیناً کسی یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ ہو گی۔ ہاں یونیورسٹی میں ہی ایسی بگڑی ہوئی مخلوق پائی جاتی ہے۔

''میرا تعلق اسی شہر سے ہے، اور تم؟'' اس نے آپ جناب کے تکلفات پر خط تنسیخ کھینچ کر بات شروع کی۔

''میں، میں لاہور سے ہوں۔''

''گھبراؤ مت، میں کہیں بھی بیٹھ سکتی تھی، لیکن تم شکل سے کچھ شریف آدمی لگے تو یہاں بیٹھ گئی'' وہ اب بھی مجھے دیکھے بغیر بول رہی تھی۔ اور میں نے گھبرانا کیا تھا میں تو اسے دیکھتے ہوئے دل میں خدا کے مہربان ہونے کا شکریہ ادا کر رہا تھا جس نے اتنی جلدی میرے دل کی مراد پوری کر دی تھی کہ میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی تصور کر رہا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس طرح کی اپر کلاس کی لڑکی کبھی مجھ سے بات کرنا بھی پسند کرے گی، یہ سب خدا کی مہربانیاں ہیں اور آج مجھے خدا کے مہربان ہونے کا یقین ہوا تھا اور اس بات کا بھی کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

''موسم کیسا ہے؟'' اس نے سامنے دیکھتے ہوئے خدا جانے خود سے کہا تھا، یا مجھ سے پوچھا تھا اس لیے اس غیر یقینی حالت میں مجھے اس کا جواب نہ دینا بداخلاقی لگا اور اسے خدا کی طرف سے اپنے لیے بھیجی گئی عطا خیال کر کے اپنی طرف سے ذو معنی انداز میں کہا ''محبت بھرا''۔ اب اس نے مجھے دیکھا اور پوچھا ''کیا تم محبت پر یقین کرتے ہو؟''

''ہاں کرتا ہوں،

اور کون ہے جو نہیں کرتا، سورج، چاند، ستارے سب محبت کی ڈور سے بندھے ہیں، محبت کے بغیر انسان کا دل پتھر ہو جاتا ہے، محبت کائنات کا پہلا قانون ہے'' میں جانتا تھا کہ رٹا رٹایا فلسفہ بول رہا ہوں کیونکہ مجھے محبت پر نہ کوئی خاص یقین تھا نہ تجربہ تھا، میں نے تو اس لیے اس کی بات کا جواب دیا تھا کہ میں نے سنا تھا کہ عورت کا دل نرم ہوتا ہے اور وہ صرف محبت کی بات ہی سمجھتا ہے۔

لیکن وہ کچھ مختلف انداز کی عورت تھی بولی

''اوہ!!، تم کہیں شاعر تو نہیں؟'' اس نے میرے سارے فلسفے کی ایسی کی تیسی کر دی اور میں سمجھ گیا کہ یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔

''ہاں بس، تھوڑا بہت''۔

''اخ..... کبھی محبت کی بھی ہے؟ یا شاعری کر کے دل بہلا لیتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میرے جیسے مڈل کلاس محبت کا طوطا ہی پالتے ہیں لیکن میں نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے محبت کا اعتراف کسی اور حوالے سے کیا کیونکہ میری چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ روایتی محبت کا اعتراف یہاں کام نہیں کرے گا لہٰذا مسکرا کر کہا ''ہاں، کی ہے محبت، شاعری سے۔''

''ہاہاہاہا..... تو پھر تم نہ تو شاعری جانتے اور نہ محبت'' اس نے میری بات پر قہقہہ لگا کر کہا۔

مجھے اس کے قہقہہ پر غصہ سا آ کر رہ گیا اور براہ راست ہو گیا اور پوچھا ''تم بتاؤ، تم نے کی ہے محبت؟''

وہ یکدم سنجیدہ ہو گئی اور ذرا توقف کے بعد بولی ''ہاں، سو بار۔''

اب میری باری تھی میں نے بھی انتقاماً قہقہہ لگا کر کہا ''یہ محبت ہے یار روزانہ کی شاپنگ؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے پھر کہا ''مگر تم نے سو بار محبت کی ہے تو یہاں اکیلی کیوں ہو؟، سو میں سے کسی ایک کو تو تمھارے ساتھ ہونا چاہیے تھا ناں؟'' لیکن بات کرتے ہوئے میں ساتھ دیکھ بھی رہا تھا کہ اس کے چہرے اور پھر آنکھوں میں شدید غم اور اداسی کے سائے تھے۔

''یہی تو دکھ ہے'' اس نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''کیا مطلب؟''

''سو بار محبت میں نے کی، دوسری طرف ہمیشہ ہوس رہی'' اس نے یہ بات بڑے کرب کے ساتھ ہی لیکن میرے اندر شاید غصے کا ہلکا سا دھواں ابھی باقی تھا جس کے باعث اس کی بات سمجھے بغیر کہا ''تمھاری محبت خالص نہیں ہو گی ناں۔''

''خالص محبت؟ یہ کیسی ہوتی ہے؟'' اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا، اس کی کھچا آنکھوں کی لالی میں نمی کے ڈورے تھے جنھیں میں سہار نہ سکا اور بے تکے پن سے کہا ''خالص محبت میں ایک دوسرے کے لیے جان تک دینا پڑتی ہے۔''

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا تو میں سمجھا کہ میری بات سے مرغوب ہو گئی ہے۔ لیکن ذرا توقف کے بعد بولی ''محبت نفرت سے شروع ہوتی ہے، نفرت کا دوسرا نام محبت ہے۔''

''واہ، گہرا جملہ ہے، لیکن میرے پلے نہیں پڑا، شاید کسی کے بھی پلے نہیں پڑے گا۔'' میں نے کہہ دیا لیکن پھر ڈر بھی لگا کہ وہ کہیں

اٹھ کر چلی نہ جائے۔

تب وہ جیسے اپنے آپ سے بولی "انسان کی اپنی ذات میں جو کمیاں ہوتی ہیں وہ ان سے نفرت کرتا ہے اور اسے کسی ایسے شخص سے محبت کرنا پڑتی ہے، جس میں وہ ساری خوبیاں ہوں جو اس میں نہیں، تاکہ وہ اپنی ذات کی تکمیل کر سکے، یوں محبت خود غرضی بھی ہے، اور لالچ بھی، تم پتہ نہیں کس خالص محبت کی بات کرتے ہو؟"۔

مجھے قلق سا ہوا کہ وہ ذہنی طور پر مجھ پر حاوی ہو رہی تھی۔ "اور اگر ایسا کوئی خوبیاں والا نہ ملے تو ذات کی تکمیل کیسے ہو گی؟" اس دفعہ میں نے بھی سلیقے کا سوال کر ہی لیا تھا۔ لیکن اس بار بھی اس کا جواب اتنا عجیب تھا کہ مجھے اپنا اہم سوال بھی بیکار لگنے لگا۔ کہنے لگی "شاید..... تکمیل کا بہترین حل موت ہے" پھر اس نے تیسرا سگریٹ جلا کر لمبا کش لگایا۔ میں حیران تھا کہ اس ننھی سی جان کا معدہ اتنی زیادہ مقدار میں اتنا کسیلا دھواں کیسے برداشت کر لیتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے یکدم اس طرف دیکھا جدھر سے قہقہوں کا شور سا اٹھا تھا۔

دائیں طرف سے چار لڑکے آ رہے تھے جن کی جینز کی پینٹ عقب سے ڈھلکی ہوئی اور آستین گھٹنوں میں لٹک رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف سے منڈے ہوئے سر کے اوپر مٹھی بھر بال کانٹوں کی طرح کھڑے تھے، ان کے دانت تاروں سے بندھے تھے۔ پھر اچانک خاموش ہو کر میرے سامنے بیٹھی لڑکی کو گھورنے لگے۔ مجھے شک ہوا کہ شاید وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

پھر جانے کیا ہوا کہ لڑکی یکدم قے کرنے لگی، اور قے کرتے ہوئے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھ کر اٹھی اور جھکی جھکی سی چل کر بائیں طرف جنگلے کے پاس جا کر سیدھی کھڑی ہو کر سانسیں بحال کرتے ہوئے نیچے پہاڑی پر اگی جھاڑیاں اور اس سے بھی نیچے بل کھاتی سڑک کو دیکھنے لگی۔ اس کی انگلیوں میں دبا سگریٹ دھواں چھوڑ رہا تھا۔ میں اسے پیچھے سے دیکھ رہا تھا کہ پھر کچھ بہت ہی عجیب ہوا، کہ وہ جنگلے سے نیچے کود گئی۔ اس کی جگہ فضا میں لمحہ بھر سگریٹ کا دھواں لہرایا اور غائب ہو گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ ان لڑکوں نے بھی غالباً یہ منظر دیکھ لیا تھا اور وہ ایک طرف دوڑ پڑے تھے۔

ریسکیو والوں کو اس کی لاش ڈھونڈنے اور نکالنے میں دو گھنٹے لگے۔ میری آنکھوں میں آنسو کب کے خشک ہو چکے تھے، خدا کی شکر گزاری کا جذبہ میرے اندر ختم ہو گیا تھا۔ میرا ذہن ماؤف تھا اور لگ رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں شاید میں بھی قصوروار ہوں۔ مجھے ساکت بیٹھے اتنی دیر گزر چکی تھی کہ اندھیرے میں ہوٹل والے لڑکے نے آ کر کہا "رات ہو گئی ہے صاحب؟"

☆☆☆☆☆

چابی والی موٹر

شفیع ہمدم
مترجم: ابن حسین شعیب الرحمٰن

"ابا میں بھی موٹل لوں گا"
ننھے کالو نے حاکم کا ہاتھ پکڑ کر اپنی توتلی زبان سے کہا۔
"کون سی موٹر؟"
حاکم نے اسے اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔
"وہ ہے نا گدو اس کا ابا آج اس کے لیے چابی والی موٹل لایا ہے۔ لال لنگ کی ہے۔ میں بھی اسی طرح کی موٹل لوں گا۔"
کالو نے گود میں مچلتے ہوئے کہا۔
"بالکل ہم اپنے بیٹے کو موٹر ضرور لے کر دیں گے"
حاکم نے اسے تسلی دی۔ یہی سن کر کالو خوشی خوشی باہر چلا گیا اور دوسرے بچوں سے کہنے لگا۔
"میرا ابا بھی مجھے موٹل لا دے گا۔ میں بھی موٹل چلاؤں گا۔"
یہ سن کر ایک دس گیارہ سال کا بچہ بولا: موٹر والا تو دیکھو تمھیں تو پیٹ بھر کے کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔
"کیوں نہیں ملتا میں ابھی کھانا کھا کر تو آیا ہوں"
کالو نے معصومیت سے جواب دیا۔
"جرا اپنی موٹل تو دکھائیں"
کالو نے گڈو کی موٹر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا لیکن گڈو نے موٹر دکھانے کے بجائے اسے زور سے دھکا دیا تو وہ پاس پڑے اینٹوں کے ڈھیر پر جا گرا۔ ایک نوکیلی اینٹ سے اس کا سر پھٹ گیا۔ سرخ لال لہو دیکھ کر وہ ڈر گیا اور روتا ہوا گھر چلا گیا۔ اس کے والدین اسے خون میں لت پت دیکھ کر گھبرا گئے۔ اس کی ماں نے جلدی سے اپنا ڈوپٹا پھاڑ کر پانی سے اس کا زخم صاف کیا اور پٹی باندھ دی۔
"بیٹا تجھے یہ چوٹ کیوں لگی؟"
اُس کے باپ نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔
"گدو نے مجھے دھکا دیا تھا۔"

کالو نے نحیف آواز میں جواب دیا۔
"اس نے تجھے دھکا کیوں دیا؟"
اس کی ماں نے پوچھا۔
"میں نے اس سے دیکھنے کے لیے موٹر مانگی اس نے مجھے دھکا دے دیا۔"
"ابا میرے لیے بھی موٹر لے آؤ نا۔"
کالو نے امید بھری نظروں سے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"بالکل میں اپنے بیٹے کے لیے موٹر ضرور لاؤں گا، اب تو سو جا تجھے درد ہو رہا ہوگا۔"
کالو نے آنکھیں بند کیں تو اس کے سامنے تین سرخ رنگ کی موٹریں گھومنے لگیں۔ یہی سوچتے ہوئے وہ سو گیا۔
"میں لال رنگ کی موٹر چلاؤں گا ابا میرے لیے موٹر لائیں گے۔"
کالو نیند میں بڑبڑاتا رہا۔ اس کے والدین اسے نیند میں اس طرح بولتے دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ حاکم کو اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ وہ اپنے بیٹے کی چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہ کر سکتا تھا۔
میرے رب تو بھی کتنا بے نیاز ہے۔ امیر لوگ اپنے بچوں کی خوشی کے لیے گڈے گڈی کی شادی پر ہزاروں خرچ کر دیتے ہیں۔ غریب کی بیٹی کے بال باپ ہی کے گھر میں سفید ہو جاتے ہیں۔ وہ سہاگ کا سرخ جوڑا پہن کر باپ کے گھر سے رخصت ہونے کے بجائے موت کا سفید کفن پہن کر ہزاروں من مٹی کے نیچے سوتی ہیں۔ وہ دنیا کی اونچ نیچ بارے سوچتے ہوئے سو گیا۔ اس کو ساری رات خواب میں موٹریں نظر آتی رہیں۔ لال، پیلی اور سبز موٹریں، چھوٹی بڑی اور طرح طرح کے ڈیزائنوں کی موٹریں، چابی والی پیاری پیاری موٹریں۔
وہ ایک دفتر میں چپڑاسی تھا۔ اس کی تنخواہ بہت کم تھی۔ وہ ان پیسوں میں بڑی مشکل گھر چلاتا تھا۔ دوسری صبح جب وہ دفتر جانے لگا تو کالو کو تیز بخار تھا۔ یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ کالو کی دوا کہاں سے لاؤں گا۔ اس کے لیے موٹر کس طرح خریدوں گا۔ اس کی جیب بالکل خالی تھی۔
"ابا میرے لیے موٹر جرور لے آنا"
کالو نے کمزور آواز میں کہا۔
"ضرور بیٹا پریشان نہ ہو تیرے لیے موٹر ضرور لے آؤں گا۔"
حاکم نے اسے جھوٹی تسلی دی۔ پانچ چھے برس کے کالو کو کیا پتا تھا کہ اس کے باپ کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ حاکم بھاری قدموں کے ساتھ دفتر چلا گیا۔ راستے میں اسے ایک سے ایک رنگ کی موٹریں سڑک پر دوڑتی ہوئی نظر آئیں۔ جب کوئی لال موٹر اس کے قریب سے گزرتی اس کی آنکھوں میں کالو کا چہرہ گھومنے لگتا۔ جب وہ دفتر پہنچا تو اس کے افسر نے پچاس کا نوٹ دیتے ہوئے کہا:

"حاکم بازار سے پپو کے لیے چابی والی موٹر لے آ۔ آج اس نے موٹر کے لیے کہا تھا۔"
چابی والی موٹر کا سن کر کالو کا زخمی چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔ کالو نے بھی اسے آج موٹر کے لیے کئی مرتبہ کہا تھا۔ انھیں سوچوں میں غرق وہ صاحب کے بچے کے لیے موٹر لینے بازار گیا۔ اس نے ایک دکان سے ایک بڑی اور خوب صورت چابی والی موٹر کی قیمت پوچھی تو دکان دار نے پینتالیس روپے بتائے۔ اس نے پچاس کا نوٹ دکان دار کی طرف بڑھاتے ہوئے لال رنگ کی چھوٹی سی موٹر کی قیمت پوچھی۔ پچیس روپے کہہ کر دکان دار دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔
پچیس روپے اس کے دماغ میں گھومنے لگ گئے۔ کاش میرے پاس پچیس روپے ہوتے میں کالو کے لیے یہی موٹر خرید لیتا۔ اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے موٹر چوری کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن بچارے نے آج تک چوری کرنے کا خیال تک نہ کیا تھا۔ ایک دم اتنا بڑا کام کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ وہ خیالوں کی دلدل میں اترتا چلا گیا پھر کالو کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔ اس نے سوچا کہ صاحب کے بیٹے کی موٹر کالو کو دے دوں لیکن وہ اتنے حوصلے کا بندہ نہیں تھا۔ پھر کانپتا ہوا ہاتھ لال رنگ کی موٹر کی طرف بڑھایا لیکن اس طرح واپس کھینچ لیا جیسے وہ موٹر نہ ہو زہریلا سانپ ہو۔
شام کو جب وہ گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ کالو کا بخار اور تیز ہو گیا تھا۔
"ابا میرے لیے موٹر لائے ہو"
کالو کی آواز خاصی کمزور تھی۔
"بیٹا میں کل تیرے لیے موٹر لاؤں گا آج ساری دکانیں بند تھیں۔ کل میں ضرور تیرے لیے موٹر لاؤں گا۔"
اس نے تاکید کی۔ حاکم بہت پریشان تھا۔ میں کب تک اپنے بیٹے سے جھوٹ بولتا رہوں گا۔ اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال پیدا ہوا۔
"کل میں مزدوری کروں گا۔"
اپنی شادی سے پہلے وہ مزدوری کرتا تھا پھر شادی کے بعد ایک بندے کی سفارش پر یہ نوکری مل گئی تھی۔
"میں مزدوری کر کے کالو کے لیے موٹر ضرور خریدوں گا۔"
لیکن چھٹی کے دن صاحب کی کوٹھی پر بھی جانا ہوتا ہے۔ میں کل صاحب کی کوٹھی پر نہیں جاؤں گا۔ کہہ دوں گا کہ میرا بیٹا بہت بیمار تھا۔ زیادہ سے زیادہ مجھے ڈانٹ پڑ جائے گی۔
دوسرے دن مزدوری کی تلاش میں صبح سویرے گھر سے نکل گیا اس نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک جگہ پر مستری اور

مزدور ایک مکان بنا رہے ہیں۔ ایک موٹا تازہ بندہ سفید کپڑے پہنے اخبار پڑھ رہا تھا۔

"مزدور کی ضرورت ہے بابو جی؟"

حاکم نے اس کے پاس جا کر ادب سے پوچھا۔

"بالکل، لیکن صرف آج کے دن کے لیے کل ہمارا پرانا مزدور آ جائے گا۔"

موٹے بندے نے اسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے بھی صرف آج کے لیے کام چاہیے ہے۔ حاکم نے کہا ، اس کی آنکھوں میں خوشی کے جگنو چمکنے لگے - وہ دوسرے مزدوروں اور معماروں کے ساتھ دوپہر تک کام کرتا رہا۔

وہ بہت تھک گیا تھا کیوں آج وہ بہت عرصہ بعد مزدوری کر رہا تھا۔ دوپہر کو سارے مزدور کھانا کھانے لگ گئے۔ کوئی گڑ کے ساتھ روٹی کھانے لگا تو کسی نے پیاز اور چٹنی سے کھانا کھایا۔ وہ گھر سے روٹی نہیں لایا تھا سی لیے اس نے ایک دکان سے چنے خرید کر کھائے ، نلکے سے پانی پی کر سچے رب کا شکر ادا کیا۔

کچھ دیر بعد انھوں نے پھر کام شروع کیا۔ کام بہت مشکل تھا اسے تسلے میں سیمنٹ اٹھا کر لکڑی کی سیڑھی سے دوسری منزل پر جانا پڑتا تھا۔ اس کا سارا شریر پھوڑے کی طرح دکھنے لگا لیکن وہ حوصلے سے کام کرتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا شام ہونے والی ہے جب میں کالو کے لیے موٹر خرید کر گھر جاؤں گا اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں گی اور اس خوشی سے اس کا بخار بھی اتر جائے گا۔ کالو کا معصوم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا تو وہ خیال ہی خیال میں کالو کو لال موٹر سے کھیلتا دیکھنے لگا۔ یک دم اس کا پاؤں سیڑھی سے پھسلا ، دوسری منزل سے اینٹوں کے ڈھیر پر گرتے ہی اس کی روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔

جب اس کی خون میں لت پت لاش گھر لائی گئی تو اس کی بیوی لاش دیکھ کر غم سے بے ہوش ہوگئی۔ اسے جب ہوش آیا تو لوگ اس کے خاوند کو منوں مٹی تلے دبا کر پلٹ آئے تھے۔

پھر اس کی بیوی اپنا اور کالو کا پیٹ پالنے کے لیے لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگی۔

کالو جب اپنی ماں کو پوچھتا:

"ماں ابا کہاں چلا گیا ہے؟"

تو وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی:

"تیرا ابا اللہ سائیں کے پاس تیرے لیے موٹر لینے گیا ہے۔"

یہ سن کر وہ خوش ہو کر کہتا:

"آہا جی میلا ابا اللہ سائیں کے پاس میلے لیے موتل لینے گیا ہے۔ میلا ابا میلے لیے لال لنگ کی موتل لائے گا۔ میں بھی موتل چلاؤں گا۔"

☆☆☆☆☆

ہجوم

وہ آج بھی تھکا ہارا مایوسی کے اندھیروں میں سفر کرتا، دل فگار کے ساتھ امیدوں کی گٹھڑی لگائے، ایک ریل کار کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ ایک انجانی سمت کی جانب چل رہا تھا۔ اُس کی عمر یہی کوئی چالیس سے اکتالیس سال کے درمیان ہوگی، مگر چہرے کے خدوخال اور اُس پہ کھنچی ہوئی آڑھی ترچھی لکیروں نے، اُسے وقت سے پہلے ہی اس قدر بوڑھا کر دیا تھا کہ وہ ایک مرجھائے ہوئے درخت کی مانند لگتا تھا جس کی ٹہنیاں دھیرے دھیرے خشک ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اُس کا نام سمیر تھا، لیکن گھر، محلے والے اور دوست احباب سبھی اُسے زندہ دل خان کہتے تھے، جو جہاں جاتا اپنی بذلہ سنجی کی بدولت چھا جاتا اور اداس سے اداس دل بھی اُس کی باتوں پہ کھل اٹھتا۔ یہ خزاں کا موسم تھا اور اس وقت سورج بالکل افق کے کنارے سے جا لگا تھا، اور فضا پہ ایک عجب سی اداسی چھائی تھی جس سے طبیعت بہت زیادہ بوجھل محسوس ہوتی تھی۔ وہ ایک نامعلوم منزل کی جانب رواں تھا، اور اُس کے قدموں تلے درختوں کے پتوں کے روندے جانے کی آوازیں چرر چرر کے ساتھ آ رہی تھیں۔

کچھ دیر آگے چل کر ایک میدان نما جگہ آ گئی، جہاں مقامی آبادی کے بچوں نے درخت صاف کر کے، کھیلنے کا ایک میدان بنایا ہوا تھا، اور وہ اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ اس جنگل نما ویرانے میں شاید یہ جگہ ایسی تھی، جہاں اُسے زندگی کے کچھ آثار جب نظر آئے، تو اُس نے وہیں رُکنے کا فیصلہ کیا اور ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پوری دلجمعی کے ساتھ اُن بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنا شروع ہو گیا۔

وہ ان معصومیت بھرے بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنے میں مگن تھا، کہ اُس کے قریب چار نوجوانوں کی ایک ٹولی آئی اور زمین پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ مالٹے اور مونگ پھلی اپنے ساتھ لیکر آئے ہوئے تھے، اور بیٹھتے ہی اُن کے ساتھ انصاف کرنے میں مشغول ہو گئے۔

یار! آج سردی کچھ زیادہ نہیں ہے؟ یا پھر مجھے لگ رہی ہے؟

واجد علی

ایک نوجوان نے مالٹا چھیلتے ہوئے تھوڑا کپکپاہٹ کے ساتھ جب یہ کہا، تو اُس کے بالکل ساتھ بیٹھا اُس کا دوست، اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھنا شروع ہو گیا۔

ظاہر ہے جی، جب آپ اپنی خوراک سے زیادہ محبوب کی خوراک پہ دھیان دیں گے، تو جسم میں کمزوری تو پیدا ہو گی۔

اس پہ ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا، جس نے گویا خاموشی کے تالاب میں موجیں پیدا کر دیں، جو مرکز سے نکل کر کناروں کی جانب پھیلنا شروع ہو گئیں اور پورے منظر کی خاموشی پہ چھا گئیں۔

اچھا مگر کیسے؟ کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے ---

تیسرے نے معنی خیز انداز میں جب یہ کہا تو اُس نوجوان نے شرما کر یوں منہ پھیر لیا، جیسے کوئی نئی دلہن ہو۔ اُس کے رخساروں پہ مارے شرم کی لالی سی دوڑ گئی اور یوں راز افشا ہونے پر خاصی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

بھائی اب آپ لوگوں سے کیا پردہ۔ وہ ہے نا، اپنی حسینہ دلربا، نازک ادا---

باقی سب سوچ میں پڑ گئے کہ کس کی بابت بات ہو رہی ہے۔ جبکہ سمیر اُن کی باتوں کو پورے انہماک سے سن رہا تھا۔

ارے یار تم سب بھی گھامڑ ہو۔ وہی جو خان کے چوبارے میں رہتی ہے اور کالج میں پڑھتی ہے۔ بھئی وہی ہے مجرم، جس نے اپنے یار کا دل چرایا ہے۔ اور اب بھائی صاحب ہیں کہ دن رات تڑپتے ہیں، مچلتے ہیں، اور آہیں بھرتے ہیں۔ ایسے میں بتاؤ بھلا صحت کہاں سے بنے؟

پیار، محبت کا ذکر جو چھڑا تو سمیر کی یادوں کے دریچے بھی یکدم روشن ہو گئے اور اُسے بھی وہ دن یاد آ گئے، جب وہ بھی کسی کی محبت میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اور سمیر کے دوست بھی اُس کا ایسے ہی مذاق اڑاتے تھے۔ اُس کی حالت دیکھ کر ہنستے تھے اور اشاروں، کنایوں میں اُس کے دل کے تار چھیڑتے تھے۔

سمیر! اگر ثوبیہ تجھے نہ ملی تو کیا کرو گے؟

امین نے ایک دن ایسے ہی دوستوں کے درمیان بیٹھے ہوئے، اُس سے جو سوال کیا تو سمیر کے چہرے کے تاثرات سے یوں مترشح ہو رہا تھا کہ یہ سوال اُسے ناگوار گزرا ہے۔ وہ تو ثوبیہ کی محبت میں سرتاپیر گرفتار تھا اور اُس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے لیے ثوبیہ ہی کل کائنات تھی اور وہی اُس کا کل جہاں تھا۔

ارے کیا سوچ رہے ہو؟ کچھ تو جواب دو بھائی۔ تم تو بالکل مجنوں بن گئے ہو۔ یار! وہ ایک عام سی لڑکی ہے اور بس---

یہی تو مسئلہ ہے تمھارا۔ تمھیں کیسے اپنی آنکھیں دے دوں، جس سے میں اُسے

دیکھتا ہوں۔
سمیر کے ہونٹوں پہ اداس بھری مسکراہٹ تھی، مگر اُس کا دوست امین ابھی تک اُس کی بات کا مطلب نہیں جان سکا تھا۔ اُسے محبت کی نفسیات اور تقاضوں کا مطلق علم نہ تھا۔ اُسے بھلا کیسے علم ہو سکتا تھا کہ ثوبیہ اُس کے لیے ایک عام لڑکی ہو سکتی ہے، کیونکہ اُسے محبت کا نشہ جو نہیں لگا تھا۔ سمیر جو ثوبیہ کی محبت کا نشے میں گرفتار تھا، کوئی اُس سے پوچھے تو وہ بتائے کہ ثوبیہ کتنی خاص لڑکی ہے۔
اچھا یہ بتا تو ثوبیہ کے ساتھ باتیں کیا کیا کرتا ہے؟ جب بھی دیکھو کسی پارک کے کونے کھدرے میں بیٹھے کھسر پھسر کر رہے ہوتے ہیں، اور آپس ہی میں ہنس رہے ہوتے ہیں۔ آج ہمیں بھی بتا دو بھائی تم دونوں کون کون سی باتیں کرتے ہو۔ کیونکہ نہ تو تم افلاطون ہو اور نہ ہی وہ کوئی کسی یونیورسٹی کی پروفیسر۔
شامی نے اُسے کریدنے کی کوشش کی، کہ دونوں کے درمیان ہونے والے رازو نیاز کے بارے میں کوئی علم ہو سکے۔
ثوبیہ! آج آسمان کتنا پیارا لگ رہا ہے؟ وہ دیکھو تو--- نیلا نیلا سا--- کیا ہی خوبصورت آسماں ہے---
سمیر، ثوبیہ کے ساتھ ایک پارک میں بنچ پر بیٹھا ہوا، انگلی سے آسماں کی جانب اشارہ کر رہا تھا، اور ثوبیہ بھی پوری یکسوئی سے اوپر دیکھ رہی تھی۔
ویسے سمیر آسماں تو وہی ہے--- لیکن شاید یہ محبت کا اثر ہے--- جو انسان کو ہر سماں، ہر لمحہ، ہر جگہ خوبصورت نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ورنہ وہی آسماں ہے، وہی اُس کا نیلا رنگ ہے۔ لیکن--- لیکن اگر تم کسی اور سے پوچھو تو بس یہی کہے گا، کہ ہاں جی آسماں ہے۔
سمیر اور ثوبیہ کے پیار کی کہانی کو دو سال ہو چلے تھے، لیکن اُن کے گھر والے اس بات سے بالکل بے خبر تھے۔ سمیر کے چند خاص دوستوں کے علاوہ کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کس کے دام محبت میں گرفتار ہے، اور نہ ہی ثوبیہ کی کسی دوست کو اس بات کا پتہ تھا کہ ثوبیہ کسی کو دل دے بیٹھی ہے۔ دونوں کی محبت بھی امر بیل کی طرح نہ جانے کب پھوٹی اور کب پل بھر میں جوان ہو کر آنگن کی دیواروں سے بھی باہر نکل گئی۔ وہ دونوں محبت کے اسیر تھے اور یہ وہ اسارت ہے جو انسان کو تکلیف نہیں بلکہ لطف دیتی ہے۔ وہ بھلے اس محبت کی آگ میں سلگتا ہے مگر یہ سلگنا ہی اُس کا کل حاصل زندگی ہے۔ ایک محبت کرنے والے انسان کی زندگی بامعنی ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنی منزل کے حصول کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی بھی دینے کو

تیار ہو جاتا ہے۔ وہ ہر دوسرے یا تیسرے دن وقت مقررہ پر، ایک مخصوص پارک میں ملتے تھے اور ایک دوسرے کے دیدار سے اپنی محبت کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن وائے شوق کہ یہ آگ ٹھنڈا ہونے کے بجائے، مزید تیز ہوتی جارہی تھی اور اس کے شعلوں کی تپش سے دونوں کا دل جل رہا تھا۔ یہ آگ وصل اور شوق کی آگ تھی، جس نے ان کے دلوں کو زندگی بخش رکھی تھی۔

سمیر کی زندگی ایک معمول پہ چل رہی تھی۔ وہ کالج میں جاتا تھا، اور پھر واپس آکر کچھ دیر گھر میں آرام کرکے، دوستوں کے ساتھ شام رنگین کرنے چلا جاتا تھا۔ اُس کے دوست بھی فکر زندگی سے آزاد، جوانی کی اوائل دہلیز پہ قدم رکھے، شاداں و فرحاں جارہے تھے۔ سبھی دوست گھومنے کے شوقین اور چٹکلہ بازی کے ماہر تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ لطیفوں کے تبادلے کرنا ہی اُن کی واحد تفریح تھی۔ امین، نوشاد، صہیب اور سمیر سبھی ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ، محلے دار بھی تھے اس لیے اُن سب کے والدین اس بات سے مطمئن تھے کہ اُن کے بچے کس کے ساتھ جاتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ سبھی متوسط گھرانوں کے چشم و چراغ تھے، جن کی محدود سی خواہشات اور عام انسانوں جیسے خواب تھے۔ سب ہی ایک جیسی سوچ اور عادات کے مالک تھے اور زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارنے کے ارمان سجائے، وقت کے کاروان کے ساتھ رواں دواں تھے۔ مگر اچانک سمیر کی زندگی میں تو بیہ آگئی اور اُس کی زندگی کا رخ بدل گیا۔ وہی سمیر جو راہ چلتے سیٹیاں بجاتے، گنگناتے اور اٹکھیلیاں کرتے جاتا تھا، اب دیکھتے ہی دیکھتے اتنا سنجیدہ ہوگیا کہ دیکھنے والوں کو حیرانگی ہوتی تھی۔

ویسے صوبہ خان! یار یہ اپنے خواجہ صاحب کے بیٹے سمیر کو کیا ہوا ہے؟ پہلے تو یہ ایسے نہیں ہوتا تھا۔

نیاز بابو نے صوبہ خان کی دکان سے دہی لیتے ہوئے، اُس سے حیرانگی سے پوچھا تو صوبہ خان ہنس پڑا۔

ارے بابو جی! لگتا ہے کسی اچھے انسان کی صحبت میں بیٹھنا شروع ہوگیا ہے، اُسی کی صحبت کا اثر لگتا ہے۔

اچھا! میں سمجھا شاید خواجہ صاحب کی دعائیں کام آگئی ہیں۔ جب بھی ملتے تھے یہی کہتے تھے کہ سمیر پڑھائی کی طرف بالکل دھیان نہیں دیتا۔ کہیں ان پڑھ ہی نہ رہ جائے۔

ہاہاہاہاہا۔ یار بابو جی ویسے تم کہتے تو ٹھیک ہو۔ میرے پاس بھی جب آتے ہیں یہی بات کرتے ہیں۔ اُن کا بہت دل کرتا ہے کہ

اُن کا بیٹا ڈاکٹر بن جائے اور وہ یہاں سے کسی اچھی جگہ شفٹ ہو جائیں۔

چلو اچھا ہے کہ خواجہ صاحب کا بیٹا کسی نیک انسان کی صحبت میں بیٹھنا شروع ہو گیا ہے۔ اب لگتا ہے کہ خواجہ صاحب کا خواب شاید پورا ہو جائے۔

محلے کے اندر آہستہ آہستہ اب اس بات کا چرچا ہونا شروع ہو گیا، کہ خواجہ صاحب کا بیٹا بدل گیا ہے۔ اب وہ لڑکیوں کے راستے میں کھڑا نہیں ہوتا، اُن کو دیکھ کر بے ہودہ شعر نہیں پڑھتا، بے مقصد گھومتا نظر نہیں آتا، اور نہ ہی آوارہ گردی میں مشغول ہوتا ہے۔ وہ اب کھلنڈرے نوجوان کی جگہ ایک سنجیدہ مرد بن چکا تھا، جس کی شخصیت میں ٹھہراؤ اور گفتگو میں سلیقہ چھلکنا شروع ہو گیا تھا۔ تاہم یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس بلاو کے پیچھے کوئی بزرگ نہیں بلکہ محبت تھی۔ ایک انسان کی محبت جس نے سمیر جیسے بے پروا لڑکے کو، یوں راہ راست پہ لگایا کہ اب وہ سمیر، سمیر ہی نہیں رہا تھا۔ کیا محبت میں اتنا ہی جادو ہے، وہ اکثر اپنے آپ سے بھی یہی سوال پوچھتا تھا۔

صہیب! آج کتنے دن ہو گئے ہیں مگر سمیر کہیں نظر نہیں آیا۔ آخر چکر کیا ہے؟

صہیب، باقی دونوں دوستوں کے ساتھ ایک نہر کے کنارے بیٹھا کچھ متفکر سا نظر آ رہا تھا۔ باقی دونوں دوست نہر کے پانی میں اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر پانی قدرے دھندلا ہونے کے سبب، اُس میں اُنہیں اپنا عکس نظر نہیں آ رہا تھا۔

سمجھ نہیں آتی کہ اُسے ہوا کیا ہے؟ پہلے تو تین بجتے تھے اور میرے گھر کے دروازے پہ پہنچ جاتا تھا، مگر اب یہ حالت ہے کہ بھائی صاحب کا کبھی کبھار دیدار نصیب ہوتا ہے اور وہ بھی ایسے کہ بس واجبی سی دعا، سلام کر کے نکل جاتا ہے۔

ہیں کیا واقعی؟

امین کی یہ بات سن کر دونوں کے چہروں پر حیرانگی کی لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ اور ایک دوسرے کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھنا شروع ہو گئے۔ صہیب بار بار سر میں کھجلی کر کے، معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، جبکہ امین اور نوشاد اپنی انگلیاں ہونٹوں پہ رکھے اس سوچ میں غلطاں تھے کہ اُن کے دوست کو ہوا کیا ہے؟ شام کی اداسی پورے منظر پہ چھائی تھی اور دور کھیتوں سے لوگ اب دن بھر کھیتی باڑی کرنے کے بعد، گھاس کے گٹھڑ اٹھائے، بکریوں کو ہانکتے، واپس گھروں کو جا رہے تھے۔ وہ سب عموماً اس وقت، اسی نہر کے کنارے بیٹھے، نہر کے پانی میں پاوں ڈبوئے، کنکروں سے لہریں پیدا کرتے، اُن کسانوں کو واپس آتا ہوا

دیکھتے تھے۔ اس منظر میں نہ جانے کیا کشش تھی کہ اُن کا دل اس منظر سے کبھی بھرتا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک عام سے دن کی ایک عام سی شام تھی، جب ثوبیہ کہیں سے گھومتے پھرتے اُس نہر کے پاس آئی اور سمیر کی شام کو خاص کر گئی۔ وہ ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر اُس کی آنکھوں میں یوں مقید ہو گیا، کہ پھر وہی لمحہ اُس کا حاصلِ زندگی بن گیا۔ ثوبیہ کے ساتھ اُس کی آنکھیں کیا چار ہوئیں، کہ دونوں ہی ایک دوسرے کو پہلی ملاقات میں دل بیٹھے۔ ثوبیہ اپنے کسی عزیز کے یہاں آئی ہوئی تھی، جس کا گھر کہیں پاس ہی تھا۔ اُس نے گلابی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے، اور لبوں پہ ہلکی ہلکی سی سرخی لگا رکھی تھی۔ وہ اُس وقت بالکل ایک تازہ کھلا ہوا گلاب لگ رہی تھی، جس کی ایک ایک پتی کھل کر، سراپا متبسم تھی۔ سمیر نے جونہی ثوبیہ کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں کھو گیا۔ اُس کی جھیل سی آنکھوں میں نہ جانے کیا کشش تھی کہ سمیر، اُن آنکھوں میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ ثوبیہ کو بھی علم ہو چکا تھا کہ سمیر اُس کی زلفوں کے جال میں بندھا جا رہا تھا۔ ثوبیہ بظاہر نہ تو غیر معمولی حسن و جمال کا پیکر تھی اور نہ ہی کوئی ایسی الہڑ مٹیار جو جس طرف کو آ نکلے وہیں قیامت ڈھا دے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُس کی نہر پہ آمد نے اُن تینوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا، سوائے سمیر کے۔ سمیر نے اُس کو دیکھا تو دل میں محبت کا ٹمٹماتا چراغ، نہ جانے کیسے بھڑک اٹھا اور اُس نے سمیر کے دل کو عشق کی آگ سے یوں روشن کر دیا کہ سمیر بے حال ہو کر رہ گیا۔ صیاد اپنا کام کر کے چلا گیا، اور صید مرغِ بسمل کی طرح تڑپنا شروع ہو گیا۔

سمیر! او بھائی تمہیں کیا ہوا ہے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو تم ٹھیک تھے۔ اب اچانک کیا ہو گیا ہے تمہیں؟

نوشاد نے سمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا، جس کی نگاہیں اسی سمت لگی ہوئی تھیں، جس طرف وہ ثوبیہ گئی تھی۔

ہاں سمیر! خیر تو ہے۔ تو ایک دم تو چپ ہو گیا ہے؟

صہیب نے بھی شدید حیرانگی سے پوچھا۔

کچھ نہیں یار۔ بس ---- بس کچھ ہو گیا ہے۔ کاش! کوئی جائے اور اُسے روک لے۔

سبھی دوست انگشت بدنداں تھے کہ ذرہ سی دیر میں ایسا کیا ہوا کہ شرارتی اور ہنسنے والا سمیر، اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا اور بے تابی کے ساتھ آہیں بھرتے ہوئے، چکر کاٹ رہا تھا۔ اور پھر اگلی شام پہلی شام سے بھی زیادہ حسین اور انمول تھی، کیونکہ سمیر جونہی وہاں پہنچا، تو کچھ ہی دیر میں ثوبیہ بھی وہاں پہنچ گئی اور پھر دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں دید

کے جام لنڈھانے لگے اور وہ سرمئی شام کے رنگ، پیار کے رنگوں میں ڈھلتے گئے۔ یہ رنگ پیار کا رنگ تھا جو اتنا مضبوط اور گہرا ہوتا ہے، کہ پھر لاکھ کوشش انسان کر لے، یہ رنگ نہ تو دھلتا ہے، نہ ماند پڑتا ہے۔

اُس دن کے بعد سمیر کا یہ حال ہو گیا کہ تمام دن اُسے شام کا انتظار رہتا، کہ کیسے دن ڈھلے اور شام ہو اور وہ پھر سے وہیں جا کر بیٹھے، جہاں ثوبیہ اُسے ملی تھی۔ وہ کالج میں بھی کھویا کھویا رہتا اور گھر آنے کے بعد، اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتا اور پھر خاموشی کے ساتھ خلاؤں کو گھورتا رہتا۔ کبھی اُٹھ کر باہر دھوپ سے وقت کا اندازہ لگاتا، تو کبھی گھڑی پہ وقت دیکھ کر، انتظار کی طویل گھڑیاں گزارتا۔ لیکن وقت تھا کہ شیطان کی آنت، جس کی ہر ساعت برسوں پر محیط تھی۔

تم ٹھیک کہتی ہو ثوبیہ — یہ محبت کا ہی اثر ہے، جو ہر دل کو بدل کے رکھ دیتا ہے اور آنکھ کے دیکھنے کا زاویہ یوں تبدیل ہو جاتا ہے کہ پھر انسان کو محبت کے رنگ کے سوا، کوئی رنگ نظر ہی نہیں آتا۔

مگر.....

ثوبیہ کچھ کہتے کہتے اچانک رک گئی۔ اُس کی آنکھوں کی چمک بھی دھندلا گئی اور چہرے کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا۔ اُدھر سمیر کے ماتھے پر بھی شکن نمودار ہو گئیں کہ خدا جانے ایسی کیا بات ہے جو ثوبیہ کہتے کہتے رک گئی۔

مگر کیا؟ تم رک کیوں گئی؟ کہو نا۔ ہم دونوں کے بیچ یہ سوچ کی دیواریں کب سے حائل ہونے لگیں۔

مگر یہ کہ سمیر کہیں یہ محبت کا موسم بدل ہی نہ جائے۔ آج جو بے قراری اور چاہت ہمارے بیچ میں ہے۔ کہیں — کہیں انا کی تیز آندھی سب کچھ بہا کر ہی نہ لے جائے اور ہم ایسے ہو جائیں جن کے پاس خسارے کے کانٹے چننے کے علاوہ کچھ بھی نہ بچے۔

ثوبیہ کے منہ سے ایسی باتیں سن کر، وہ بھی چپ ہو گیا اور کسی گہری سوچ میں چلا گیا۔ پھر دونوں بنچ سے اُٹھ کر کسی فکر میں گرداں ہو کر ادھر اُدھر گھومنا شروع ہو گئے۔ وہ اس واہمے اور خیال کو بار بار دل و دماغ کے ہر گوشے سے نکال کر، امیدوں کے چراغ جلانا چاہتے تھے، لیکن سوچ تھی کہ کسی صورت جدا ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

اب بھی وہی پارک تھا، وہی رونق تھی، وہی پرندے تھے اور وہی اُن کی چہچہاٹ تھی، لیکن ثوبیہ اور سمیر کے دلوں کا موسم اب بدل چکا تھا۔ خوشی کی جگہ غم، ارمانوں کی جگہ خدشات اور امیدوں کی جگہ مایوسیوں نے لے لی تھی۔

ثوبیہ! کہاں تھیں لڑکی تم؟ تمہارے ابا کالج سے چکر لگا کر آ گئے کہ وہ آج کالج سے جلدی چلی گئی تھی۔ کہاں گئی تھی؟ کس کے ساتھ؟ بتاؤ ذرا۔

ثوبیہ ایک دن سمیر سے ملنے کے بعد، گھر میں جونہی داخل ہوئی تو ماں دروازے پہ ہی اُسے روک کر، کھڑی ہوگئی۔ اُس کی باتوں میں غصہ نمایاں اور تیوری چڑھی ہوئی دیکھ کر ثوبیہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ امی کی باتوں کی آواز سن کر، اُس کا چھوٹا بھائی جو سکول میں میٹرک کا سٹوڈنٹ تھا وہ بھی باہر نکل آیا اور مشکوک نگاہوں سے بہن کو دیکھنے لگا۔

ثوبیہ ایک سہمے ہوئے بچے کی طرح، اپنے آپ کو پوری طرح سمیٹے، دونوں پاؤں مضبوطی سے ساتھ جوڑے، نگاہیں جھکائے بس چپ چاپ مجرم کی طرح کھڑی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ محبت اس معاشرے کا سب سے بڑا جرم ہے اور اگر یہ جرم عورت کی جانب سے بھی سرزد ہو، تو اس کی سزا موت سے کم نہیں ہے۔ اُس کے دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہو چکی تھی کہ لگتا تھا شاید دل اچھل کر سینے سے باہر نکل آئے گا۔ آنکھوں کے آگے مکمل اندھیرا اور دماغ کے سوچنے کی صلاحیت سب ختم ہو چکی تھی۔ وہ اس بات کو سوچ کر مزید خوفزدہ ہو رہی تھی کہ اب آگے کیا ہوگا؟ اُس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں محبت کا راز طشت از بام ہو جائے گا اور یوں وہ سب گھر والوں کی نظر میں بدکردار بن جائے گی۔

---اس سے پہلے کہ بات بڑھ جائے اور یہ خبر سارے محلے میں پھیل جائے، میں تو کہتی ہوں گلو کے ابا، اس کلموہی کے ہاتھ پیلے کر دو۔ اگر کچھ دن اور انتظار کیا تو یہ سارے خاندان میں ہماری ناک کٹوا دے گی---

ثوبیہ کی ماں، رات کو اپنے کمرے میں شوہر کے ساتھ دھیمی آواز میں جب یہ بات کر رہی تھی تو ثوبیہ وہیں کمرے کے باہر کھڑی، سانسیں روک کر یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ ابا کمرے میں بے چینی کے ساتھ چکر کاٹ رہے تھے۔ اُن کا سر جھکا ہوا تھا جبکہ آنکھیں بیٹی کے دیے گئے دکھ کی وجہ سے بوجھل تھیں۔ وہ شاید کسی منصوبے پہ سوچ رہے تھے، اور اس کی جزئیات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ اماں پلنگ پہ بیٹھی، اُن کے جواب کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ باہر صحن میں اندھیرا تھا اور فضا میں خاموشی۔ ایک پراسرار اور گہری خاموشی، جو قبرستانوں میں ہوتی ہے۔ ثوبیہ کا دل بدستور تیزی سے دھڑک رہا تھا اور امیدوں کے چراغ ٹمٹما رہے تھے، جو کسی بھی وقت اچانک بجھ سکتے تھے۔ وہ ماں باپ کا فیصلہ سننے کے لیے

بے چین تھی، اور چاہتی تھی کہ جلد سے جلد مشکل کی یہ گھڑیاں ختم ہوں اور پتہ چلے کہ اُس کا کیا ہونا ہے۔

آج ہفتے کا دن تھا اور ثوبیہ دلہن بن کر، شادی ہال میں بیٹھی بارات کا انتظار کر رہی تھی۔ سب سکھیوں کی بھی انجمن میں وہ دلہن بنی یوں لگ رہی تھی، جیسے کسی نے اُسے زبردستی کھینچ کے یہاں لا بٹھایا دیا ہے۔ وہ بظاہر ہر بات پہ مسکرا کر، اپنی رضامندگی کا اظہار کر رہی تھی، لیکن دل کا عالم --- اُس سے کون آگاہ ہو سکتا ہے۔

اُس کا دل اور روح یوں مجروح ہو چکی تھی کہ اب کتنی ہی رفوگری کر لو، وہ زخم کبھی بھی نہیں بھر سکتے تھے۔ وہ اندر سے اب مر چکی تھی اور اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سب لوگ اُس کی بارات پہ نہیں بلکہ جنازے پر جمع ہیں۔

اُس کا دل بس یہی چاہتا تھا کہ وہ بے تحاشا روئے --- اس قدر روئے کہ اُس کی چیخوں کی آواز، اُس کے باپ کے کانوں تک پہنچ جائے۔ وہ باپ جو سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود، انجان بنا ہوا تھا۔ وہ جو دیکھ سکنے کے باوجود، بیٹی کے آنسو نہیں دیکھ پا رہا تھا، وہ جو سب کچھ سننے کے باوجود، بیٹی کی خاموش آہوں کو نہیں سن پا رہا تھا۔ ایک عجب تماشا تھا کہ وہ ثوبیہ جس نے سمیر کے ساتھ زندگی نبھانے کے خواب دیکھنے کے علاوہ، کچھ بھی نہیں دیکھا تھا، وہ اپنی زندگی کا نیا سفر ایک ایسے شخص کے ساتھ شروع کرنے جا رہی تھی، جو اُس کو کبھی پسند نہیں رہا۔ جس کے ساتھ اُسے بات کرنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا، وہ اُس کی منکوحہ بن کر، اب اُس کے ابرو اشارہ کے زیرِ تحت زندگی گزارنے جا رہی تھی۔ اُس کی ماں سب کچھ جانتی تھی، اپنی بیٹی کی پسند، ناپسند سے بھی واقف تھی۔ لیکن خاندانی ناموس اور وقار پہ اپنی بیٹی کو قربان کرنا، اپنے لیے وہ باعثِ افتخار سمجھتی تھی۔ وہ بیٹی کی آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسو بھی دیکھ رہی تھی، اور اس کے سینے میں سلگتے انگاروں کی تپش کو بھی محسوس کر رہی تھی، مگر پھر بھی اُسے بیٹی کی بلی دے کر، خاندانی عزت کو بچانا عزیز تھا۔

سمیر کی زندگی ثوبیہ سے راہیں جدا ہونے کے بعد، بے رنگ اور بے کیف ہو چکی تھی۔ اب نہ ہواؤں میں وہ سرور تھا، نہ موسم میں وہ نکہت۔ نہ بہار کا بانکپن تھا نہ رت میں وہ چاشنی تھی۔ دنیا کے سامنے اُس کا وجود تو برقرار تھا، لیکن اُس وجود کو اب دیمک لگ چکی تھی۔ محبت کے فراق کی دیمک، جو اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی اور وہ کھوکھلا ہو کر گرنے کے قریب جا پہنچا تھا۔

ثوبیہ ہماری شادی کو آج تین سال ہو گئے ہیں۔ لیکن تم مجھے کبھی خوش نظر نہیں آئیں۔

کیا بات ہے؟

اُس کے شوہر نے چائے کا کپ ثوبیہ کے ہاتھ سے پکڑا اور پھر، اُسے اپنے پاس زبردستی بٹھا کر پوچھا، تو ثوبیہ نگاہیں جھکائے بس اپنے پیروں کو گھور رہی تھی۔ شوہر کے ہاتھ میں چائے کا کپ بدستور وہیں رہ گیا اور وہ ثوبیہ کے منہ سے جواب سننے کا منتظر تھا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی، ایک چڑیا کہیں سے اڑتی ہوئی اندر آگئی اور پھر واپسی کا راستہ نہ پا کر وہیں اندر چکر کاٹنے لگ پڑی۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں، کبھی ایک دیوار سے تو کبھی دوسری دیوار سے جا ٹکراتی، مگر شاید اُسے واپسی کا راستہ بھول چکا تھا۔ کمرے کا دروازہ تو کھلا تھا، لیکن پھر بھی اُسے واپسی کی راہ نظر نہیں آرہی تھی۔

ثوبیہ! پلیز اگر کوئی بات ہے تو بتاؤ۔ ہوسکتا ہے میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ میں تمہارا شوہر ہی نہیں، تمہارا دوست بھی ہوں۔

مسئلہ یہی ہے کہ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔

اُس نے بے دلی سے شوہر کی بات کا جواب دیا اور پھر اُس چڑیا کو دیکھنا شروع ہوگئی، جو باہر نکلنے کیلئے بے تابی سے چکر کاٹ رہی تھی۔ اُس نے کچھ دیر تک یہ منظر دیکھا اور پھر وہاں سے اُٹھ کر باہر نکل گئی۔

خالہ جان! سمیر آج بھی کمرے ہی میں لیٹا ہوا ہے؟

یہ صہیب تھا جو اپنے دوست کی خیریت دریافت کرنے، اُس کے گھر جا پہنچا تھا۔ سمیر کو آج دس دن سے زیادہ ہوگئے تھے، مگر وہ گلی میں نظر نہیں آیا تھا۔

ہاں بیٹا!

ماں نے ایک افسردہ سانس بھری اور پھر صہیب کو اپنے ساتھ، سمیر کے کمرے میں لے آئی، جہاں منظر ہی الگ تھا۔ اُس کے پلنگ کے پاس فرش پر، سگریٹس کا ایک ڈھیر پڑا تھا، جبکہ راکھ، بکھر کر پورے فرش پہ پھیل چکی تھی۔ سمیر بے سدھ ہو کر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا، جسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاید روح پرواز کر چکی ہے۔ دھوپ کی کرنیں چھن چھن کر، کھڑکی سے آرہی تھیں، جس کی وجہ سے کمرے میں قدرے روشنی تھی اور یہی وہ واحد چیز تھی جو اُس کے کمرے میں زندگی کی گواہی دے رہی تھی۔

سمیر!۔۔۔ سمیرا۔۔۔ اُٹھو یار۔۔۔ دیکھ باہر سب تیرا انتظار کر رہے ہیں۔

صہیب نے اُس کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا تو، اُس نے ہلکی سی انگڑائی لیکر، آنکھ کھول دی۔ جیسے ہی اُس کی نگاہ صہیب اور ساتھ میں کھڑی اپنی ماں پر پڑی، تو فوراً سیدھا ہو کر، چارپائی پہ بیٹھ گیا اور پھر اپنے آس پاس کے منظر کو یوں حیران ہو کر دیکھنے لگا، جیسے وہ کسی قید خانے میں بے ہوشی کے عالم میں لایا گیا

تھا اور اب اُسے ہوش آئی ہے۔
ہائے اللہ! کیا ہو گیا ہے میرے بیٹے کو۔۔۔ جانے کس دشمن کی نظر لگ گئی ہے اسے۔
ماں سے اپنے بچے کی یہ حالت نہ دیکھی گئی اور دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھا کر، خدا سے روتے ہوئے اُس کی صحت کے لیے دعا مانگنا شروع ہو گئی۔ وہ بہت کچھ خدا سے کہنا چاہتی تھی، مگر شدت جذبات سے معمور اُس کی ممتا، بس چپ چاپ آنسو بہائے خدا کی درگاہ میں اپنی عرضی پیش کر رہی تھی۔ سمیر اک نگاہ صہیب پہ ڈالتا تھا، جو اُس کے کمرے کی الماری میں پڑی کتابوں کی گرد جھاڑ کر، اُنہیں واپس رکھ رہا تھا، تو کبھی ماں کی طرف جو بے بسی کے ساتھ آنسو بہائے خدا سے بیٹے کی صحت یابی کی دعا مانگ رہی تھی۔
یہ لو! ہم اسے کہاں کہاں ڈھونڈ رہے تھے اور یہ یہاں بیٹھا ہے۔ حد ہو گئی یار۔
امین نے اُس کی کمر پہ ایک مکا مارا تو سمیر کے ذہن نے جھٹکا کھایا۔ اُسے کچھ پل تو بالکل بھی سمجھ نہیں آئی کہ اُس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ وہ کہاں ہے اور یہ سب کیا ہے؟
اور بھئی میاں مجنوں صاحب! سناؤ اس جنگل میں کیا کر رہے ہو؟ کیا آج لیلیٰ نے اسی جنگل کا پتہ دیا تھا جو ہمیں چھوڑ کر یہاں چلے آئے۔
صہیب نے چٹکلہ اڑایا تو باقی دوست بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے، جس سے جنگل میں قہقہوں کا طوفان امڈ آیا اور یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اچانک اندھیرے میں کئی چراغ روشن کر دیے ہوں۔ سمیر بھی اب ہوش میں آ چکا تھا اور جب اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو اُسے علم ہوا کہ رات خاصی پڑ چکی ہے۔
تم۔۔۔ تم لوگ یہاں کیسے پہنچے؟
سمیر نے عام سے لہجے میں پوچھا۔
بس پہنچ گئے۔ کیسے پہنچے۔ یہ نہ پوچھو۔ بس پہنچ گئے۔
نوشاد نے قدرے غصے سے کہا، جیسے اُسے یہاں اس وقت آنا اچھا نہیں لگا تھا۔
تم اچھے خاصے وہاں ہمارے ساتھ ہجوم میں کھڑے، مداری کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اچانک ہجوم سے نکل کر تنہائی میں یہاں کیوں آ گئے؟
امین نے تیز اور تلخ لہجے میں پوچھا۔
میں کب تنہا تھا۔ میرے ساتھ اتنا بڑا ہجوم تو تھا۔
کدھر ہے ہجوم؟ کہاں ہے؟ ہمیں تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔
صہیب نے حواس باختگی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھ کر پوچھا۔
تم نہیں جان پاؤ گے، یہ کون سا ہجوم ہے اور کس کا ہجوم ہے۔

☆☆☆☆☆

فریب

ایا! بڑے دنوں بعد آئی ہیں۔ نمرا نے دروازہ کھولتے ہی سوال داغ دیا۔ بس کیا کروں گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی آج بہت دل چاہا اور سب کام چھوڑ کر بھائی سے اور تم سے ملنے کے لیے چلی آئی حریم نے جواب دیا میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں آپ بیٹھیں پھر باتیں کریں گے یہ کہہ کر نمرا کچن میں چلی گئی حریم سامنے رکھے ٹی وی پر چینل ادھر ادھر گھمانے لگی۔ اتنے میں دروازے پر بیل ہوئی اور تھوڑی دیر بعد نمرا کے ساتھ ایک دیکھی بھالی شکل کی لڑکی اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی جو بڑے پرجوش انداز میں حریم سے گلے ملی کیا حال ہے تمہارا اگر تم آج مجھے یہاں پر نہ ملتیں تو میں تمہارا ایڈریس تمہاری بھابی سے لے کر تمہارے گھر پہنچ جاتی اتنا دل چاہ رہا تھا تم سے ملنے کو لیکن میڈم کا کوئی اتا پتہ ہی نہیں ہے وہ نان سٹاپ بولتی گئی کچھ دیر تو حریم حیرانی سے اس کی شکل دیکھتی رہی اور پھر جلد ہی سمجھ میں آ گیا او ہو! یہ تو میری کلاس فیلو شہزادی ہے بہت باتونی اور بہت تیز طرار لڑکی شہزادی نے بیٹھتے ہی حریم کا انٹرویو لینا شروع کر دیا کہاں رہتی ہو کتنے بچے ہیں میاں کیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس نے حریم سے ان کے کوائف کے بارے میں اس طرح معلوم کرنا شروع کر دیا گویا انٹرویو لے رہی ہو حریم اس کا حلیہ دیکھ رہی تھی جو کہ پہلے سے یکسر مختلف تھا اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی رنگین چشمہ، جینز، ماڈرن ہیئر کٹ، پہلے جیسی سادہ تو بالکل بھی نہیں لگ رہی تھی سکول میں پڑھتے ہوئے شہزادی کے حالات بہت مختلف تھے۔ اس کے والد مزدوری کرتے تھے اور والدہ ایک پرائیویٹ ہسپتال میں ایل ایچ وی کے طور پر کام کرتی تھیں۔ گھر بھی عام سا تھا بس گزر بسر ہو رہی تھی تب ہی تو حریم کو شہزادی کو پہچاننے میں اتنا وقت لگا حریم سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شہزادی میں اس قدر تبدیلی آسکتی ہے ابھی حریم اور شہزادی باتیں کر ہی رہی تھی کہ نمرا چائے بنا کر لے آئی حریم سارا وقت گھر پر کیا کرتی رہتی ہو؟ شہزادی نے پوچھا۔ کیا کرنا ہے گھر کے اور بچوں کے کاموں میں ٹائم کا پتہ ہی نہیں چلتا حریم نے جواب دیا۔

لو یہ کیا بات ہوئی تم اپنی زندگی ضائع کر رہی ہو اتنا پڑھنے لکھنے کا کیا فائدہ دیکھو میں نے

سیّدہ روبینہ بخاری

خود کو کتنا مصروف کر لیا ہے میں اپنے گھر کو بھی چلا رہی ہوں اور ایک این جی او کے ساتھ کام بھی کر رہی ہوں یہی وجہ ہے کہ بہت سے فائدے بھی اٹھا رہی ہوں اور معقول رقم بھی مل جاتی ہے نہ صرف مالی فائدہ ہے بلکہ مختلف ممالک کے دورے بھی کر چکی ہوں شہزادی نے کسی ایجنٹ کی طرح ایک ہی سانس میں حریم کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

حریم اسے حیرانی سے اور رشک سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی واقعی شہزادی سچ کہہ رہی ہو شہزادی نے فضا میں قہقہہ بلند کرتے ہوئے جواب دیا اور کیا میں جھوٹ بولوں گی تم سے شہزادی نے اپنے ہینڈ بیگ سے کچھ تصاویر نکالیں جن میں کہیں پر شہزادی انگریزوں کے ساتھ کہیں سکھوں کے ساتھ کہیں جاپانیوں کے ساتھ اور کہیں چینیوں کے ساتھ کھڑی تھی اور ساتھ ساتھ بتا رہی تھی یہ میرے لندن کے دورے کی یہ ٹوکیو یہ بمبئی اور یہ بیجنگ کے دوروں کی تصویریں ہیں شہزادی نے مزید بتایا سال میں ایک دو مرتبہ غیر ملکی دورے کا اہتمام این جی او کرواتی ہے اور وہی تمام اخراجات برداشت کرتی ہے اس طرح فیلڈ ورک بھی ہو جاتا ہے اور دنیا کو دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا ہے یہ تصویریں تو کچھ بھی نہیں ہیں کسی روز میرے گھر آؤ تو تمہیں اپنی مزید تصویریں سرٹیفکیٹ تمغے اور دیگر ایوارڈز دکھاؤں حریم نے اسے ستائش بھری نظروں سے دیکھا اور کہا بہت خوش قسمت ہو شہزادی پانچ سات سالوں میں تم نے بہت ترقی کر لی۔

شہزادی نے پوچھا حریم سلائی کڑھائی تو کرنی آتی ہوگی تمہیں؟ حریم نے جواب دیا ہاں ہاں آتی ہے میں اپنے اور اپنے بچوں کے کپڑے خود سیتی ہوں شہزادی بولی پھر تو تم ہمارے ساتھ مل کر کام کر سکتی ہو اور میری طرح بہت فائدہ اٹھا سکتی ہو حریم مخمصے کا شکار تھی اور حیرت زدہ لہجے میں پوچھنے لگی کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔

ہماری این جی او غریب بچیوں کو سلائی کڑھائی سکھانے کے لیے مختلف علاقوں میں سلائی سکول کھولنے کے لیے خواتین کو 40 40 سلائی مشینیں دے رہی ہے شہزادی نے ترپ کا پتہ پھینکا اور فائل سے ایک فارم نکال کر حریم کو دیتے ہوئے بولی اس فارم کو جتنی جلدی ہو سکے پر کر کے اور ساتھ میں اپنی تین تصویریں لف کر کے مجھے فون کرنا میں آ کر یہ فارم لے جاؤں گی اور ہیڈ آفس میں جمع کروا دوں گی جلد ہی تمہارے گھر میں مشینیں پہنچ جائیں گی بس تم سلائی سکول کے لیے مناسب جگہ کا بندوبست کرو اور سمجھو یہ مشینیں تمہاری ملکیت ہیں حریم نے غیر یقینی اور حیرت زدہ لہجے میں کہا کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔

شہزادی نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا

حریم تم یہ کیا کہہ رہی ہو سمجھو تمہارا سلائی سکول کھل چکا ہے بس اس فارم کے ساتھ تمہیں صرف 10 ہزار روپے جمع کروانے ہوں گے اور یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے اتنے میں تو ایک اچھی سلائی مشین بھی نہیں آتی حریم نے کہا کوئی بات نہیں میں جمع کروا دوں گی ٹھیک ہے کوشش کرنا کہ جلدی ہو جائے کیونکہ درخواستیں بہت ہیں اور میرٹ پر سلائی مشینیں دی جائیں گی لیکن تم فکر نہ کرو تمہاری سفارش میں خود کروں گی ویسے تم ہو بڑی خوش قسمت کہ میں تم سے ملنے آئی تو باتوں باتوں میں مجھے خیال آیا کہ تمہیں ضرور فائدہ پہنچایا جائے حریم نے اسے ممنونیت کی نظروں سے دیکھا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگی میں جلد ہی فارم اور مطلوبہ رقم جمع کروا دوں گی۔

رات کو حریم نے اپنے شوہر داؤد کو شہزادی کی آمد اور ہونے والی تمام گفتگو کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور شہزادی کا دیا ہوا فارم بھی اس کے سامنے رکھ دیا اور مشورہ بھی طلب کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ داؤد نے حریم کو سمجھایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہارے پاس سلائی کا کوئی ڈپلومہ یا سرٹیفکیٹ تو ہے نہیں تم کیسے سلائی سکول چلا سکتی ہو یہ کام ناممکن ہے اور مجھے تو تمہاری یہ کلاس فیلو کوئی چالاک عورت لگتی ہے مگر حریم تو شہزادی کے دکھائے جانے والے خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی اور ان کی جلد تعبیر پانے کی دھن میں مگن تھی اس نے داؤد کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ پاکستان میں سفارش کے بل بوتے پر سب کچھ ہو سکتا ہے اور سلائی سکول تو کیا بڑے بڑے کام ہو سکتے ہیں مگر داؤد کسی طرح مطمئن ہونے کے لیے تیار نہ تھا اگلے دن جب داؤد اپنے آفس اور بچے سکول چلے گئے تو حریم نمرا کو ساتھ لے کر تصویریں بنوانے کے لیے فوٹوگرافر کے سٹوڈیو پہنچ گئی تصویریں بنوائیں اور گھر آ کر فارم فل کیا اگلے دن شہزادی کو فون کیا کہ میرا فارم مکمل ہے تم میرے گھر آؤ اور فارم لے جاؤ شہزادی نے خوشی خوشی اگلے روز آنے کا کہا اور فون بند ہو گیا حریم نے شہزادی کو آنے کا کہہ تو دیا لیکن 10 ہزار کا انتظام ہونا ابھی باقی تھا داؤد کو اس پالیسی پر یقین نہیں آ رہا تھا اور حریم کے پاس مشکل سے چار ہزار روپے تھے ایک ہزار بھابی نے دے دیے اس طرح کل پانچ ہزار روپے ہو گئے اگلے دن شہزادی حریم کے گھر پہنچ گئی۔ حریم نے فارم اور پانچ ہزار روپے شہزادی کو دیے شہزادی نے فارم بیگ میں رکھا اور روپے گننے لگی یہ کیا یہ تو کم پیسے ہیں شہزادی نے منہ بناتے ہوئے کہا میں چند دنوں میں باقی پیسوں کا بھی انتظام کر دوں گی حریم نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا شہزادی کچھ دیر بیٹھی چائے وغیرہ پی اور مزید رقم کی یاد دہانی کرواتی ہوئی رخصت ہو گئی رقم کا انتظام کرنا حریم کے لیے اتنا آسان کام نہ تھا اب ہر دوسرے تیسرے دن شہزادی مزید رقم کے حصول کے لیے فون کرنے لگی۔

جب بھی فون پر بات ہوتی تو حریم اس سے وعدہ کرتی کہ میں جلد بندوبست کر کے تمہیں اطلاع دے دوں گی شہزادی کو فارم اور پانچ ہزار روپے دیے ہوئے تقریباً 10 دن ہو چکے تھے آج پھر شہزادی کا فون باقی رقم کے تقاضے کے لیے آیا تھا شہزادی کی آواز فون پر بہت تھکی تھکی سی لگ رہی تھی حریم رقم کا انتظام ہوا یا نہیں شہزادی نے پوچھا بس ایک آدھ دن میں ہو جائے گا فکر مت کرو میں کوشش کر رہی ہوں تم نے درخواست جمع کروا دینی تھی میں پیسے دے دوں گی۔ وہ تو میں نے جمع کروا دی ہے لیکن اس کے ساتھ رقم بھی تو جمع کروانا پڑے گی اور سنو حریم 5 سو روپے کا ایزی لوڈ میرے نمبر پر بھیج دو میرا بیلنس ختم ہو گیا ہے تم نے میری اتنی فون کالز کروا دی ہیں اور اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ لو ایک اور مصیبت ابھی میں پانچ ہزار جمع کر رہی ہوں اور نیا خرچہ 500 کا بیلنس بھی کروا دو حریم بڑبڑائی چند دن بعد حریم نے کسی نہ کسی طرح باقی رقم کا بھی انتظام کر لیا اب اس نے سوچا کہ شہزادی کو فون کر کے بلا لے ابھی وہ ارادہ کر ہی رہی تھی کہ شہزادی کا فون آ گیا حریم میرا ایک اور چھوٹا سا کام ہے اپنے میاں سے کہہ کر ایک آدمی کو ان کے آفس میں نوکری دلوانی ہے دیکھو میں اس آدمی سے نوکری دلوانے کا وعدہ کر چکی ہوں بہت ضرورت مند ہے وہ نوکری کے لیے 25 ہزار روپے دینے کو بھی تیار ہے پلیز تم اپنے میاں سے بات کرو چاہے کچھ عرصے کے لیے عارضی طور پر ہی رکھوا دیں۔ شہزادی حسب عادت نان سٹاپ شروع ہو گئی حریم نے کہا یہ ممکن نہیں کوئی اور بات کرو داؤد سرکاری ملازم ہیں اور وہ کسی کو اس طرح نوکری پر نہیں رکھوا سکتے سرکاری محکموں کے اپنے قواعد و ضوابط ہیں ویسے بھی اب پہلے جیسے حالات نہیں ہیں نوکری کے حصول کا پروسیجر بہت مشکل ہو گیا ہے اس نے حریم کی بات پوری سنے بغیر فون بند کر دیا حریم سوچ میں پڑ گئی اس دن شہزادی جس انداز میں باتیں کر رہی تھی لگ رہا تھا کہ اس کو روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں اور دو دن پہلے موبائل کے لیے ایزی لوڈ مانگ رہی تھی اور جس طرح اس نے کسی آدمی کی نوکری کے لیے بات کی تو کیا شہزادی کو جو ساری دنیا میں گھومنے کے دعوے کر رہی ہے یہ بھی نہیں معلوم کہ سرکاری نوکری حاصل کرنے کے کیا قواعد و ضوابط اور کیا شرائط ہیں حریم انہی سوچوں میں گم تھی جتنا شہزادی کے بارے میں سوچتی گئی اتنا ہی الجھتی گئی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ شہزادی کے گھر جا کر اسے ملا جائے اور اس کے گھر کی ظاہری حالت سے بھی اس کی باتوں کا موازنہ کر کے کسی بہتر نتیجے پر پہنچا جائے لیکن شہزادی کے گھر کا اسے پتہ نہیں تھا پھر اس نے سوچا کیوں نہ شہزادی کی امی کے گھر جایا جائے وہیں سے اس کے گھر کا بھی پتہ مل جائے گا اگلے ہی روز حریم شہزادی کی امی کے گھر پہنچ گئی اس نے شہزادی کی امی کو

سلام کیا اور اپنا تعارف کروایا۔
وہ بڑی محبت سے پیش آئیں اور اندر لے گئیں گھر کی حالت پچھلی حالت سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی وہی چھوٹا سا گھر معمولی سا سامان حریم نے شہزادی کے بارے میں پوچھا تو اس کی امی آبدیدہ ہو گئیں اور کہنے لگی میری شہزادی کے مقدر میں اللہ نے سکھ نہیں لکھا ایک تو اس کی شادی ایسے شخص سے ہوئی جو بہت ظالم ہے اسے کام کرنے کی بالکل عادت نہیں کام چور ہونے کی وجہ سے ہر وقت گھر میں جھگڑا اور مار پیٹ چلتی رہتی ہے اسی وجہ سے سسرال والوں نے بھی گھر سے نکال دیا ہے اور آج کل وہ یہیں رہ رہی ہے یہی وجہ ہے کہ شہزادی نے کسی جگہ نوکری شروع کر دی ہے شکر ہے کہ گزارا چل رہا ہے حریم اور شہزادی کی والدہ ابھی باتیں کر ہی رہیں تھیں کہ شہزادی بھی گھر میں داخل ہوئی وہ اسی حلیے میں تھی جس میں اس کی حریم سے ملاقات اس کے بھائی کے گھر پہ ہوئی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ اس دن حریم حیرانی سے شہزادی کو دیکھ رہی تھی اور آج شہزادی حریم کو آخر اس نے اپنے حواس پر قابو پایا اور بولی اوہ حریم! تم یہاں اچھا تم باقی رقم لائی ہوں گی لاؤ مجھے دکھاؤ حریم نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا میں پچھلے ایک گھنٹے سے تمہاری امی سے تمہارے متعلق ہی باتیں کر رہی ہوں تمہاری امی نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے اب تم سچ سچ بتا دو کہ تم کس این جی او کے آفس میں کام کر رہی ہو شہزادی چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی میں ایک آفس میں ریسپشنسٹ کی جاب کرتی ہوں اس کے علاوہ جب پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو جس طرح تمہیں فارم دیا تھا اسی طرح کسی نہ کسی کو فارم پر کروا کے اور سلائی مشینوں کا کہہ کر کچھ رقم حاصل کر لیتی ہوں یا پھر کسی ضرورت مند کو نوکری دلوانے کا کہہ کر کچھ رقم حاصل کر لیتی ہوں اور وہ جو تم نے اپنے غیر ملکی دوروں اور غیر ملکیوں کے ساتھ تصویریں دکھائی تھی حریم نے سوال کیا شہزادی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا وہ سب تصویریں یہیں کی ہیں لاہور اور ننکانہ صاحب میں کھنچوائی گئی تصویریں ہیں۔
حریم پر شہزادی کی حقیقت کھل چکی تھی حریم اپنے گھر واپس آتے ہوئے سوچ رہی تھی ہدایت صرف اللہ کی طرف سے ہی ملتی ہے ورنہ شیطان تو انسان کو بہکا کر شیطان ہی بنا دیتا ہے شہزادی کے والدین نے بھی ساری عمر محنت مزدوری کرتے ہوئے غربت میں گزاری تھی لیکن انھوں نے کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا بلکہ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا یہی وجہ تھی کہ انھوں نے غربت میں بھی سکون اور عزت کی زندگی گزاری جبکہ شہزادی کتنے لوگوں کے ساتھ فراڈ کر کے بھی سکون میں نہ تھی دوسروں کو دکھ دے کر کیسے کوئی سکھ حاصل کر سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

''بولتا جنگل''

میں اکثر کسی خاموش وادی کی تلاش میں رہتا ہوں مگر شور طلاطم سدا میرے تعاقب میں رہتا ہے اس لیے میں جب بھی شہر کی ان عمارتوں اور ہجوم سے باہر نکلتا ہوں تو واپسی کا راستہ بھول جاتا ہوں۔ مجھے جنگل بلاتے ہیں اور میں خود کو ایک غیر محفوظ پرندہ سمجھ کر جنگل کی طرف بھاگتا جاتا ہوں میں اچانک کیکروں سے بھری پگڈنڈی پہ چلنے لگتا ہوں تو سرسبز پہاڑوں کی وادیوں اور جنگل میں پہنچ جاتا ہوں جہاں برف کی سفید تہیں دھوپ کو ٹھنڈا کیے رکھتی ہے۔ رات کے دامن میں بے شمار ٹمٹماتے تارے تتلیوں کے تعاقب میں کسی پھول سے بچے کی شرارتی آنکھوں کی طرح چمک رہے تھے بربتوں نے خاموشی کا انچل اوڑھ رکھا تھا۔ فطرت مجھے سوچتا دیکھ کر مسکرانے لگتی ہے اور پھر مجھے حیران دیکھ کر کہتی ہے سوالوں میں کھو جانا ہی سب سے خوبصورت جواب ہوتا ہے شاید فطرت کو نیم وا آنکھوں سے سوچتے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ شہر کی آلودہ فضا سے دور فطرت کی آغوش میں مجھے اس قدر سکون نصیب ہوا جیسے میرے دل کی زلیخا کو یوسف میسر آیا ہوں۔ یہاں کی خاموشی میں امن اور خوبصورتی کے گیت سنائی دیتی ہے پانی کی لہروں میں دیپک راگ سنائی دیتا ہے۔ اس پرمسرت فضا میں درختوں کے ساتھ میرا دل ناچ رہا تھا کہ اچانک دور سے ایک آواز مجھے سنائی دی۔

اے اجنبی مسافر..... تم کون ہوں اور کہا سے آئے ہوں؟

میں..... میں حضرت آدم کی اولاد میں سے ہوں اور میں ان اجنبی لہجوں کے ہجوم سے آیا ہوں جہاں میرے سوال گم ہو جاتے ہیں۔

آدم کی اولاد... ! آدم کی اولاد کو تو خدا نے اشرف المخلوق کے لقب سے نوازا ہے یعنی تم وہ اشرف المخلوق ہو ؟ حیرت بھری آواز نشاطیہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی---

ہاں مگر اس صدی میں آدم کی اولاد شرف

نوید عائل

اور عظمت کی معراج سے محروم ہے کیوں کہ اس صدی کے آدم کی اولاد محض مادیت پر یقین رکھتے ہیں شرف تو اس لیے بخشا گیا تھا کہ ان کے پاس عقل، دانش اور طاقت اظہار ہے مگر افسوس استعماری راج نے انسان سے اشرف المخلوق، کے اوصاف چھین کر دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔

اے سیانے اجنبی شاید تم انسانوں کی بستی سے مایوس ہو کر آئے ہو؟

جہاں سے میں آیا وہاں بارود کی حکمرانی ہے وہاں شاہ وقت سے بھیک میں ملی ہوئی زندگی جینا پڑتی ہے وہاں چھپ کی زہریلی وبا پھیل چکی ہے۔

آدم کی اولاد اور ایسے؟ اشرف المخلوق اور ایسے؟

ہاں--- اور اب اس سفاک معاشرے میں سکون تلاش کر لینا ایسا ہی ہے جیسے آذر سرشت کی شہر میں بندگی تلاش کرنا---

میں ان حسین وادیوں اور پہاڑوں کے دامن میں اپنا کھویا ہوا سکون تلاش کرنے آیا ہوں۔ شاید میرا ضمیر حسین وادیوں کی مٹی سے لیا گیا ہے اس لیے کوئی ان دیکھی طاقت مجھے یہاں لانے پر مجبور کر رہا ہے۔

انسانوں کی بستی میں اب انسانوں کی عظمت، کردار اور شعور نہیں دیکھی جاتی بلکہ طاقت، عہدہ اور سٹیٹس دیکھی جاتی ہے۔ ہم نے سنا تھا کہ غار کا انسان جسمانی طور پر ننگا تھا مگر بارود کے اس دور میں انسان روح تک بدنما پھر رہا ہے۔ شہروں گلیوں اور آبادیوں میں شعور اور ظرف کا یہ حال ہے کہ خون بہانے والے کو اعظم اور خون ریزی کو عظیم کہا جاتا ہے جب کہ جنگیں تہذیب، ورثہ، خوبصورتی، پیار، امن یہاں تک کہ انسانیت بھی کھا جاتی ہیں اور بھوک، افلاس، نفرت اور قبرستانوں کو جنم دیتی ہے۔ جنگ تو موت کا دوسرا نام ہے جب تک جنگ جاری رہتی ہے لاشوں کا رقص جاری رہتا ہے گورکنوں کی کدالوں کی موسیقی بجتی رہتی ہے اور اہل دانش سیاہ لاشوں کے تعفن سے گھٹ کر مر جاتے ہیں۔

اے اجنبی مسافر برسوں سے ایک ریت ہے کہ ان حسین وادیوں میں آدم کی اولاد آتی ہے کچھ لمحے گزارتی ہے اور چلے جاتی ہیں۔

مگر میں جانے کی امید سے نہیں آیا ہوں کیوں کہ جہاں سے میں آیا ہوں وہاں مکر فریب سے شیر نے انسانیت کے معصوم بیلوں کو جدا کر کے شکار کر لیا ہے لوگ ایک ہجوم اور ریوڑ کی طرح ہیں وہاں شہروں کے ہر چوک و چراہے پر نفسیاتی شفاخانے ہیں

مگر کوئی ایسا کندا نہیں ملتا جو لوگوں کو پاگل ہونے سے بچالے جو خودکشی سے روک دے۔
اگر آدم کی اولاد میں عقل، شعور اور ظرف نا ہو تو زمین پر فساد اور بدصورتی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔
ہوا رک گئی پانی کا شور تھم وادی میں ایسی خاموشی چھا گئی ایسا سناٹا ایسی چپ کہ جنوں کو بھی خدا یاد آ جائے۔
پھر میری آواز خوبصورت وادی اور سرسبز پہاڑوں کے درمیان گونجنے لگی ۔۔۔ کہ ہم تو جنت سے آئے تھے مگر اپنا تقدس بھول گئے ہیں شاید اس لیے اب آدم کی اولاد دوزخ کو آباد کرنا چاہتی ہے ۔
میرے سارے ساتھی مادی ترقی کی تلاش میں روح سے ناطہ توڑ کر آسائش بدن کے سفر پر روانہ ہو چکے ہیں مگر میرے سامنے بولتا جنگل میرے راستے کھلتا جا رہا ہے میرا بولتا جنگل مجھ سے کلام کرتا ہے کہ مجھ سے پہلے منو بھائی نے "جنگل اداس ہے" دیکھا ہے پھر احمد حسین مجاہد کا "دھند میں لپٹا جنگل" نمودار ہوتا ہے اور پھر جب میں "بولتا جنگل" میں داخل ہو جاتا ہوں تو پروین شاکر کی نیمی آواز میں یہ شعر گونجنے لگتا ہے کہ

تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن مور بن کر ناچتا ہے

بولتا جنگل میں پروین شاکر کی "خوشبو" محسوس کر کے اس کے پیچھے اڑنے لگتا ہوں تو میں نے ان سب چیزوں کا نظارہ کرتا ہوں جو زہرا نگاہ نے کہا تھا کہ "سنا ہے"

سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سنا ہے شیر کا جب پیٹ بھر جائے تو وہ حملہ نہیں کرتا
درختوں کی گھنی چھاؤں میں جا کر لیٹ جاتا ہے
ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں
تو مینا اپنے بچے چھوڑ کر
کوے کے انڈوں کو پروں سے تھام لیتی ہے
سنا ہے گھونسلے سے کوئی بچہ گر پڑے تو سارا جنگل جاگ جاتا ہے
سنا ہے جب کسی ندی کی پانی میں
بئے کے گھونسلے کا گندمی رنگ لرزتا ہے
تو ندی کی روپہلی مچھلیاں اس کو پڑوسن مان لیتی ہیں
کبھی طوفان آ جائے، کوئی پل ٹوٹ جائے تو
کسی لکڑی کے تختے پر
گلہری، سانپ، بکری اور چیتا ساتھ ہوتے ہیں
سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
خداوندا! جلیل و معتبر! دانا و بینا منصف و اکبر!
مرے اس شہر میں اب جنگلوں ہی کا کوئی قانون نافذ کر

☆☆☆☆☆

آج کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہوگا

خالد احمد

لو! وہی فیصلے کا دن آیا
لوگ کتنے ہرے درختوں کو
روز چولہوں میں جھونک دیتے تھے
مجرمو! یہ وہی جہنّم ہے
تم نے ہر شام جس کو جھٹلایا

لو! وہی فیصلے کا دن آیا
کوئی ہم پنجروں کو زندہ کرے

کوئی ان ہڈیوں کو لب دے دے
ہم کہ ہر دن کی طرح بے بس ہیں

آج پھر بے کسوں کا والی ہے
جس کو ہر شام ہم نے جھٹلایا
لو! وہی فیصلے کا دن آیا

میں ڈرتا ہوں کہیں مَیں مَر نہ جاؤں [جان کیٹس]

میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو جائے
کہ میری سانس رک جائے
قلم میرا ابھی میرے خیالوں کے تلاطم کو
مدور کر نہیں پایا!
ابھی تو مَیں کتابوں کے خزینوں سے
تجسّس کے قرینوں کو مسخر کر نہیں پایا

نہ شاید دیکھ پاؤں میں
شبِ تاباں کے چہرے پر
سیہ بادل کی چادر کا
طلسماتی سا اِک منظر
مُجھے محسوس ہوتا ہے
مری دلدار، میری جاں
نہ کل ہو جائے تو اوجھل مری بے تاب نظروں سے
محبت کا مزا میرے لیے معدوم ہو جائے

زمانے کے وسیع و بے کراں ساحل پہ
مَیں تنہا ___ کھڑا
یہ سوچتا ہُوں اور ڈرتا ہُوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے
محبت اور مری شہرت، اسی لمحے
فنا کا لاحقہ بن کر کہیں نابُود ہو جائیں!!

مترجم: سید افسر ساجد

اللہ مافی!

جلیل عالی

سمجھنا سہل نہیں
وہ جو چال چلتا ہے
سب اپنے
کان پکڑتے ہیں
اُس کے حیلوں پر
ورائے فہم سہی
اس کا مکرِ تازہ
مگر
یہ جانتے ہیں
کہ کچھ بھی نہیں
بعید اُس سے
یہ مانتے ہیں
کہ بس
اک اسی کا بِرتا ہے
کہ جس نے
چھین لی
اُس سے زمین پاؤں کی
اسی کو آج وہ
سر پر بٹھائے پھرتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد، مرے خالد! مرے ہمدم مرے ساتھی
کوتاہ سُخن ہیں، قد و قامت میں بڑے ہیں

خلش

حسن عسکری کاظمی

عجب سی بے کلی میں مبتلا رہنا بھی اچھا ہے
خلش سی دل میں رہتی ہے
بھلا میں کون ہوں
اور کس جگہ کا رہنے والا ہوں
کہاں سے
آب و گل کے اس جہاں میں آ گیا
اور چند سانسوں کے لیے ٹھہرا
مگر یہ بھی
عجب سا وسوسہ دل میں
پریشانی کا باعث ہے
کہ جانا ہے تو کیا سچ مچ وہاں بھی
بے کلی میں مبتلا رہنا مقدر ہے
مجھے رہنا پڑے گا
عرصۂ بے نام میں کب تک
کہ میں سب بھول جاؤں گا
جہاں آب و گل میں کتنے دکھ جھیلے
عذابِ جاں کئی کا ذائقہ چکھا
خلش سی دل میں رہتی ہے
بھلا میں کون ہوں
اور کس جگہ کا رہنے والا ہوں

تُو اور ہم

گلزار بخاری

تو ہے سورج ہم سیارے
تجھ سے نکھرے موسم سارے
بارش اولے دریا دھارے
شاخ، شگوفے، پھول، ستارے
پتّے ، غنچے پیارے پیارے
تُجھ کو ڈھونڈیں خواب ہمارے
قائم ہے تو ہم بنجارے
تجھ سے کٹ کر جی نہیں سکتے
زیست کا امرت پی نہیں سکتے
تری لو سے چاند رہیں گے
نہیں تو ہم پھر ماند رہیں گے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہر کی ویرانیوں پر نوحہ گر
رُوح بن کر رات بھر بھٹکا کروں

سچ کی قیمت

آخری دور کا دوزخی لاوا، اپنے تیز بہاؤ پہ ہے
دجالی چیلوں کے شور کا تیز بہاؤ
اور اس شور میں کوئی ایک صدا
سچائی کی ایک صدا
لیکن، آخر کب تک کتنا سچ بولیں گے؟
آخر کب تک سچ بولیں گے؟
جیسے ہمیں معلوم نہیں
جھوٹ میں کتنی طاقت ہے!
سچائی کی قیمت کیا دینی پڑتی ہے!
پیروں میں لوہے کی بھاری زنجیریں
کیوں پڑ جاتی ہیں!
قربِ قیامت کے اس عہد میں جھوٹ
کے ہاتھ بہت لمبے ہیں
اور سچائی نوکِ زباں پر رکھی ایک صدا
اپنے ہی کانوں میں گونجتی ایک صدا
گونجتی ہے تو کوئی اک شریان دماغ کی پھٹ جاتی ہے
سانس کی ڈوری کٹ جاتی ہے
آخر کب تک سچ بولیں گے--- کب تک؟
جب تک شریانوں میں اپنے لہو کا آخری
قطرہ جم نہیں جاتا
آخر اک دن جم جائے گا
لیکن جم جانے سے پہلے
شریانوں میں گھلنے والا زہر رگوں کو چیر رہا ہے
آس پاس کے بھونکتے کتے ----
راتوں کے آوارہ کتے،
برقی لہروں کی جل تھل میں،
بھونکتے بھونکتے کاٹنے کو آ نکلے ہیں
ایک بھیانک رات سروں پر آ پہنچی ہے
آنکھوں میں روشن اُمیدیں ٹوٹ رہی ہیں
لیکن ایک چراغ.... ؟

خالد علیم

وہ دِن آ گیا ہے

وہ دن آ گیا ہے
دُعائیں،
تمنّائیں،
بارگاہِ الٰہ میں
برسہا برس بعد، جب
مرتبہ مُستجابی کا پاتی ہیں

وہ دن آ گیا ہے
خوشی،
جب دریچوں، جھروکوں،
در و بام اور آنگنوں میں
اُترتی ہے شمعیں جلاتی ہوئی
رقص کرتی ہوئی، گیت گاتی ہوئی
عروسی شبیں جگمگاتی ہوئی

وہ دن آ گیا ہے
وہ دن،
قُربتیں،
رہروانِ محبت کو جب
زندگی کے نئے ذائقے بخشتی ہیں
نژادِ نوی کے گہر رولتی ہیں
وہ دن آ گیا ہے
محبت بھری ساعتوں،
راحتوں، چاہتوں کے خزینے لیے
اُمنگوں کے دلکش نگینے لیے
نئی زندگی کے قرینے لیے

وہ دن آ گیا ہے
وہ دن،
جو نویدِ ملن ہے
وہ دن،
جو تمھارا ہی دن ہے
تمھارا ہی دن ہے

[ڈاکٹر حافظ عاقب اردلان کے نام]

محمد انیس انصاری

پہلی محبت جیسا خواب

ادب سے جس کی ہے دلداری بھولی بھالی
باتیں اُس کی
پاکیزہ دن، راتیں اُس کی
اول و آخر ادب وظیفہ
ہر مجموعہ تازہ صحیفہ
جب جب، جس جس سمت وہ جائے
انسانوں کی خیر منائے
پھولوں کی بارات سجائے
امن و محبت کے نغمات
صدا الاپے وہ دن رات
"ہر صدا مسافر" اُس کی
صرف محبت راہبر جس کی
"کتے رکے نہ لاوے ٹیک"
اپنی چھاں دا سیک
جالبی، امجد، انور مسعود
سب ادبی ایاز، محمود
لکھتے رہے اُس پر مضمون
ترابی تے نہ بدلی جون
خوشبو بھری ہیں باتیں اُس کی
جگ مگ جگ مگ راتیں اُس کی
چودھویں رات کا یہ مہتاب
پہلی محبت جیسا خواب
سب کی باتوں پہ کھل جائے
بات سے محفل کو مہکائے
کرتا نہیں یہ کسی پہ وار
اپنے پرائے سب پہ نثار
عین وفا کی ہے شادابی
جو ہے ڈاکٹر نثار ترابی

[ہمدمِ دیرینہ ڈاکٹر نثار ترابی کے لیے]

راجا نیّر

اجنبی راستے

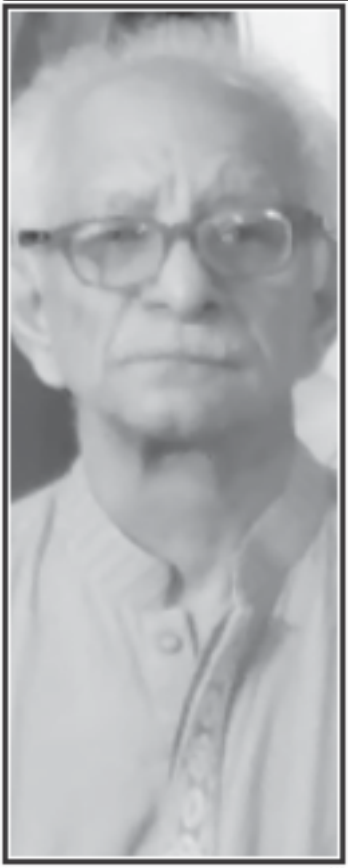

طاہر ناصر علی

اشک آنکھوں میں ہیں
آبلے پاؤں میں
سائباں دھوپ کا
سر پہ چھایا ہوا
آج تنہا ہوں میں
راہ پُرخار ہے
اور میں اپنی منزل سے
ہوں بے خبر
تُو نہیں ہے تو
دیکھے ہوئے راستے
ایسا لگتا ہے
سب اجنبی ہو گئے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مری بات کہتے رہنا ، یہ قلم اُٹھائے رکھنا
یہ علم فرو نہ کرنا ، یہ فلک سجائے رکھنا

نصیحت نامہ

امتی ہو جو نبی کے تو فقط پیار بنو
نفرتوں کا جو کرے قتل وہ تلوار بنو

سنتِ شاہِ مدینہ کو عمل میں لا کر
محفلِ زیست میں صحراؤں سے گلزار بنو

اپنا موضوعِ سخن نعتِ نبی کو کر کے
شعر گوئی کے جہاں میں شہِ افکار بنو

ہو کے دیوانۂ محبوبِ خدائے برتر
جذبۂ حب ہے تو پھر عشق کا معیار بنو

ذہن میں جسمِ نبی کا ہو فقط حسنِ جمیل
جب بھی تم مدح نگارِ لب و رخسار بنو

فضلِ رب سے ہو "ذکی" تم تو سخن دانوں میں
کر کے توصیفِ نبی خلد کے حقدار بنو

ذکی طارق

چنبے والی بُوٹی

جہاں اندھیرا چاروں جانب پھیلا ہو
دروازہ ہو اور نہ روزن
پھر ہوگا کیسے احساس
کہیں اُجالے کا کوئی امکان نہیں
کیا معلوم کہ منزل والا سیدھا رستا کون سا ہے
لیکن کوئی ہاتھ پکڑ لے اور دل کے ویرانے کو
تاریکی میں ڈوبے ہوئے زمانے کو
روشنی اور رنگوں سے بھر دے
چنبے والی بُوٹی سے

روشنی ہے چنبے کی بوٹی
زندگی ہے چنبے کی بُوٹی
آگہی ہے چنبے کی بُوٹی
جہاں جہاں پُر ہول اندھیرا ہوتا ہے
اس کی مہک سے وہاں سویرا ہوتا ہے
اسم اللہ ہے چنبے والی بُوٹی
مرشدِ کامل جسے لگاتا ہے
اُس دل میں جو صاف بھی ہو، شفاف بھی ہو
دنیا والوں نے جس دل کو روندا ہو
اور مثالِ آئینہ اُسے کرچی کرچی توڑا ہو
اُس کا گریباں چاک کیا ہو
اُسے جھنجھوڑا ہو
اپنے آپ سے جب کوئی بیگانہ ہونے لگتا ہے
اور طبیعت میں آدم بیزاری بڑھنے لگتی ہے
تو ایسے میں دھیرے دھیرے
چنبے والی بُوٹی پھلنے پھولنے لگتی ہے
دل میں اپنی جگہ بنانے لگتی ہے
جسم کی ساری اندھی گلیوں کو بینائی دینے لگتی ہے
اور ہر ایک گلی کے آگے رستا روشن کرتی ہے
ہر رستے پر منزل خود آوازیں دیتی ہے
ایسے کسی مسافر کو
اب ہر مقصد جس کے لیے ہو بے مقصد
اب ہر منزل جس کے لیے ہو کارِ زیاں
کیونکہ اُسے خبر ہے
اور کہیں ہے اُس کا جہاں

ظہور چوہان

''زخم بانٹ کر دل فتح کرنا ممکن نہیں ہوتا'' (نثری نظم)

کچھ لوگ نفرت بھی مستقل مزاجی سے کرتے ہیں
دوسروں کو رد کرنا
انہیں لذت افزا لگتا ہے
اپنے من میں تو جھانک نہیں سکتے
لیکن دوسروں کو جہنم
میں جلتے صاف دیکھ لیتے ہیں
نیکیوں کا گھمنڈ لہجوں سے حلاوت بھی
چھین لیتا ہے
منافقت
روح میں سرایت کر جائے
تو دلآزاری
پسندیدہ مشغلہ بن جایا کرتا ہے
روح کے قتل پر کوئی دفعہ نہیں لگتی
زبان کو خون کا ذائقہ بھلا محسوس ہونے لگتا ہے
ہم زبان کی انی سے دل کا خون کئے جاتے ہیں
من کی تاریکی اور تنہائی بڑھتی جاتی ہے

جان ہی نہیں پاتے کہ
زخم بانٹ کر
دل فتح کرنا ممکن نہیں ہوتا
شکست جامد شے نہیں جسے دیکھا جا سکے
یہ تو احساس کا نام ہے
وجود کی عمارت ڈھے جانے تک ہم
فتح اور شکست کا فرق بھی جان نہیں پاتے

نائلہ راٹھور

کشاکش

آنکھیں
اِردگرد کی کثافتوں
خون کے سفید دھبوں سے بھر چکی ہیں
نجانے کتنے میزائل
روحوں کے برزخ کو چھلنی
آباد گھروں کو مسمار کر چکے ہیں
ہم تباہی کے
مسمریزم میں جکڑے
دعاؤں کے بے اثر ہونے کا غم
سینوں میں چھپائے
خوف اور بھوک کے پُراسرار غاروں میں
بے یقینی کے سطحِ مرتفع پر
نجات کی شاہراہ ڈھونڈتے ہیں

نجانے
کیسی دلدل
ذہنوں میں بنجر لمحات کی کشاکش ہے
کوئی آواز سنائی نہیں دیتی
ایسے ماحول میں
کہاں سے چراغوں کا بندوبست کریں
خیر و شر کے مابین
خفیہ معاہدے کی دستاویز کا ترجمہ
کون سی زبان میں ہے

ہمیں
اچھے وقت کی افیون دینے والے
جزیروں میں سو گئے
اور ہمارے حصے کی نیند کا گوشت
کوے کھا گئے

ہم بچوں کی
چیخیں
امن کی نرسری میں
قبرستان کے کتبے پر
کہاں رکھیں؟

امجد بابر

محبت روشنی ہے

محبت کی طرف جاتے ہوئے رستے پہ
مجھ کو ڈر نہیں لگتا
کہ میں اس راستے پہ چلنے والوں کو
محبت بانٹتا ہوں اور ان کا دھیان رکھتا ہوں
محبت میں کبھی نفرت کی آمیزش نہیں کی ہے
کہ اتنا جانتا ہوں میں
محبت کی جو بیلیں ہیں
بہت حساس ہوتی ہیں
غلط ہاتھوں کا لمس ان کو
اگر تھوڑا سا لگ جائے
تو ان پر زندگی بھر پھول کوئی بھی نہیں کھلتا
محبت میں غلط فہمی دلوں میں پیدا ہو جائے
تو رسوائی کے بن کچھ بھی نہیں ملتا
اندھیرے راستوں پر چلنے والوں کو
اگر معلوم ہو جائے
محبت روشنی ہے اور
حقیقت روشنی کی یہ ہے وہ مرتی نہیں ہے
تو سبھی اس راستے پہ چلنے لگ جائیں
محبت میں اگر جذبے ہوں پاکیزہ
تو منزل ہر قدم پر ہوتی ہے اس میں
محبت کی طرف جاتے ہوئے رستے پہ
مجھ کو ڈر نہیں لگتا
کہ اس میں گھر تو بنتا ہے
کبھی بھی گھر نہیں لگتا

افتخار شوکت

ایسے کہاں ہوتا ہے؟ (نثری نظم)

ایسے کہاں ہوتا ہے؟
کہ وقت کا بے لگام دھارا
تمہاری مَن چاہی
سمت کو ہی رواں رہے
اُجلی اُجلی صبحیں
تمہارا ہی اِحساس لیے جاگیں
ماضی کے جھروکوں سے تکتی سنہری دوپہریں
تمہیں ہی دھیان میں رکھیں
سکوت میں ڈوبی سرمئی شامیں
تمہاری اور ہی رنگ بکھیریں
ایسے کہاں ہوتا ہے؟
کلیاں تمہاری آرزوؤں کی کھِلیں
پھول چار سُو تمہارے خیال کے مہکیں
خوشبوئیں تمہاری چاہتوں کی بکھریں
ایسے کہاں ہوتا ہے؟
کہ تمہاری تعبیریں تمہارے خوابوں جیسی ہوں
منزلیں تمہارے چُنے رستوں پہ منتظر ہوں
زندگی کے اَسرار و رُموز
ایک سوچی سمجھی اُلجھی گتھی ہیں
اور ایسے میں سب کچھ ایسا ہو
جیسے تم سوچو
جیسے تم چاہو
ایسے کہاں ہوتا ہے؟

طلعت شبیر

زخم نے تو بھرنا ہے

گڑیاں نچاتے ہیں
اور دھواں اڑاتے ہیں
دردِ ہجر کے لمحے، بانسری بجاتے ہیں
یاد کے سمندر میں
وصل کا کوئی لمحہ
سیپ جیسی ساعت میں
وقت کی ساعت میں
لفظ گھول دیتا ہے
عشق کی رفاقت میں، رقص کھول دیتا ہے
بارشیں برستی ہیں
کاغذی جہازوں کے بادبان اڑتے ہیں
ہر طرف تلاطم ہے
آرزو کے موسم میں،
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
راستوں سے آگے بھی راستے نکلتے ہیں
دھول بیٹھ جاتی ہے۔
سانس پھول جانے تک
یہ سفر تو کرنا ہے
زندگی کا یہ وقفہ
مختصر ہو یا لمبا
یہ سفر تو کرنا ہے۔۔۔۔

شبہ طراز

دستک

دور اس شہر سے، بہت دور

چھوٹا سا کچا اک مکان تھا وہ
نہ زمیں پر تھا اور نہ زیرِ زمیں
نہ خلا میں کھڑا مکان تھا وہ
جھاڑیوں کے عقب میں تھا روپوش
تھا تو مٹی کا لیکن آب پہ تھا
اور اس گھر کے اندھے گوشے میں
آنکھ میں اوڑھے زندگی کے خواب
روز اول سے سو رہا تھا میں
بس یہی ضد تھی کوئی آئے یہاں
اور مری نیند کو کرے بے خواب

وہ.....

رات کا پچھلا پہر تھا شاید
وہم مجھ کو ہوا یہی باید
کوئی آہٹ ہوئی ہے در پہ مرے
جھاڑ کے نیند کا میں کمبل اٹھا
جھانک کے در کی اوٹ سے دیکھا
ایک سایہ مجھے نظر آیا
اور دستک سی میرے در پہ ہوئی
بہت آہستہ اور خموشی سے
میں نے دروازہ گھر کا کھول دیا
رنگ اور نور سے بھری تھی وہ
حور تھی یا کوئی پری تھی وہ
ایک سیلاب روشنی تھا رواں
چُھپ گئیں پلکوں سے مری آنکھیں
نیند آنکھوں میں بھر گئی میری
خواب نگری سنور گئی میری
نقش بن کے جو دل پہ ثبت ہوئی
یہ در دل پہ پہلی دستک تھی

اجمل اعجاز

تیرا ملنا بھی کیسا ملنا ہے

تیرا ملنا بھی کیسا ملنا ہے

جیسے خوشبو میں رنگ گھل جائیں
جیسے بارش میں سمفنی سننا
جیسے پھولوں کی آنکھ کھلتے ہی
موسموں سے بہار ملتی ہے
جیسے رستے دیوں سے بھر جائیں
چاند اترا ہو اوک میں جیسے
جیسے دھڑکن سے گیت مل جائیں
آنکھ ملتی ہے جیسے خوابوں سے
خواب آنکھوں کو جیسے مل جائیں
جیسے شبنم کا لمس پاتے ہی
آبلوں کو سکون ملتا ہے

تیرا ملنا بھی کیسا ملنا ہے

جیسے گرتی ہوئی عمارت کے
کسی کونے میں ٹوٹ بکھرے ہوئے
آئنے کے اُداس ٹکڑے کو
کسی اپنے کا عکس مل جائے
جیسے خواہش کے اک سمندر میں
کتنی صدیوں سے رلتی سیپی کی
آب نیساں سے کوکھ بھر جائے
جیسے صحرا کے اک مسافر کو
ایک ٹیلے کی اوٹ سے یک دم
منزلوں کا نشان مل جائے

تیرا ملنا بھی کیسا ملنا ہے

جیسے وارث کی ہیر سنتے ہی
کسی رانجھے کو جوگ مل جائے
جیسے لیلیٰ سے عشق ملتا ہے
جیسے مجنوں کو روگ مل جائے
جیسے لب پر دعا مچلتے ہی
کوئی تارا فلک سے ٹوٹا ہو
جیسے جنگل کے اک مسافر کو
کوئی کٹیا دکھائی دے جائے
جیسے عیسیٰ کو عین سولی سے
کوئی زندہ اٹھا کے لے جائے

تیرا ملنا بھی کیسا ملنا ہے

خالد ندیم شانی

باپ

(فادر ڈے کے حوالے)

لگتا ہے میرا باپ مجھے روپ خدا کا
پیکر ہے محبت کا وہ شفقت ہے سراپا
سورج ہے اندھیرے میں وہ کرتا ہے اُجالا
چپ چاپ ہر اک رنج والم خود پہ سہا ہے
اپنوں سے عزیزوں سے سدا کٹ کے رہا ہے
اک ایک نوالہ ہمیں ہاتھوں سے کھلایا
چھاتی پہ تھپک کر ہے ہمیں اس نے سلایا
خود کھاتا ہے آدھی وہ ہمیں پورے کھلائے
خود آپ بنا کر وہ ہمیں دیتا ہے چائے
اس سے نہیں بڑھ کر کوئی دنیا میں کمائی
دن بھر کی مشقت سے وہ اب تھکنے لگا ہے
چپ چاپ، پریشان وہ اب رہنے لگا ہے
ہاں اسکی ہے تابع ہر اک امی کی ہاں سے
یوں تو وہ بہادر ہے مگر ڈرتا ہے ماں سے

محمد اشفاق بیگ

ممنون ساری قوم ہے اقبال آپ کی

احسان ایسا آپ نے اس قوم پر کیا
آنگن خوشی سے دیس کا سارا ہے بھر گیا
ممنون ساری قوم ہے اقبال آپ کی

غفلت کی نیند سوئے تھے سب کو جگا دیا
احساس اپنی ذات کا سب کو دِلا دیا
ممنون ساری قوم ہے اقبال آپ کی

تو نے ابھارا جذبہ جوانوں میں بے شبہ
تو نے عمل کا، منزلوں کا راستہ دیا
اقبال ساری قوم ہے ممنون آپ کی

ہندوستاں کو دی خودی کیا کیا نہیں دیا
بخشی نظر عقاب کی شاہیں بنا دیا
ممنون ساری قوم ہے اقبال آپ کی

اک تیرے جیسا رہ نما پھر قوم کو ملے
تیرے ہی جیسا کوئی تو آنگن میں گل کھلے
اقبال ساری قوم ہے ممنون آپ کی

اپنی مثال آپ ہے "بانگِ درا" تری
ملت کا درد سینے میں باتیں تری کھری
ممنون ساری قوم ہے اقبال آپ کی

عاصم بخاری

چپ

اوسکھی
کیوں چپ ہے تو؟
کچھ تو منہ سے بول ذرا
من کا بھید کھول ذرا
جان گئی میں
دیکھ ادھر تو
راہ تکتی تیری نگاہیں،
اسکو بلاتی تیری صدائیں
سن لے تو
آنے والا
تیرا پریتم آئے گا
یوں نا اپنی جان گھلا،
واسطے اسکے روپ سجا،
کجرا، گجرا
ڈال کے سکھی ری
بکھرا
اجڑا
روپ مٹا،

شور

کل شب اس قدر
شور تھا
من کے اندر
میں جب تنہائی کے
گلے لگ کر
اتنا روئی
کہ
خاموشی کے لبوں سے
بے صدا
کراہیں چیخ اٹھیں،

فصیحہ آصف خان

دُکھ (جانے والوں کے نام)

عظیم شاعر

مزار پر تیرے سر جُھکائے کھڑی ہُوئی میں

یہ سوچتی ہُوں

کہ تیری تُربت کہ جس پہ اب تک

کِسی پرندے کا گھر نہیں ہے

کوئی بھی لالہ، کوئی بھی نرگس، کوئی بھی گیندا

کِھلا نہیں ہے

کوئی بھی پودا ہرا نہیں ہے

میں تیری تربت پہ سر جُھکائے کھڑی ہُوئی ہُوں

یہ سوچتی ہُوں

تُو اِس قدر اُونچی سوچ والا

بلا کے فہم و شعور والا

تُو میٹھے الفاظ بُننے والا

متاعِ لوح و قلم کا وارث

بلا کی تپتی زمیں میں

یُوں کیسے آرام کر رہا ہے

عظمیٰ نقوی

یہ بستی تیرے بیٹوں کی.....

سن اپنی مہنگی شاموں کے
یوں سستے میں بک جانے سے
ڈرتی ہوں سانسوں کا سودا
اس کنگلے شہر میں کرنے سے
یہ بستی تیرے بیٹوں کی
زنجیروں کی، زندانوں کی
لالچ خوروں، ہشیاروں کی
اور گھٹیا قحبہ خانوں کی
ڈھولک ڈفلی شنکھ مرلی سے
چٹکی بھر سرمے، مسی سے
شبدوں کے جنتر منتر سے
اور چھب دکھلاتے دنگلے سے
دھت۔۔ رام کرے بھگوانوں کو
یہ بستی تیرے بیٹوں کی
آنکھوں کے ستھرے پانی میں
جلتے بجھتے سورنگوں کا
اور نیند سے بوجھل گھڑیوں میں
کچھ پریت جگاتے شبدوں کا
نت بھور سمے کے گیتوں کو
دھنوان بناتے بھیدوں کا

کیا مول بتا دے پائے گی
ان دھول اڑاتی گلیوں میں
دل کی گٹھڑی کس اور رکھوں
چمپا کی اور چنبیلی کی
نت جھمکے جھانجر گہنے کی
اور گورے کالے جسموں کی
بولی لگتی ہے روز یہاں
اور کال پڑا ہے آنکھوں کا

نینا عادل

نظم

شائستہ رمضان

کچھ لوگ امر ہو جاتے ہیں

وہ ہجر کی مالا جپتے ہیں

وہ ملنے سے گھبراتے ہیں

وہ چپ کی بولی سنتے ہیں

وہ من میں دیپ جلاتے ہیں

کچھ رنگ ادھورے رکھتے ہیں

انھیں بھرنے سے کتراتے ہیں

یک رنگی اوڑھے رکھتے ہیں

سب کا جیون مہکاتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

باتوں میں چھپا رہے ہیں باتیں
جتنے دکھ ہیں سب اَن کہے ہیں

ایک نظم

نوید صادق

۔۔۔دھیان کے تاریک گوشوں میں
کہیں کچھ ہے جسے دریافت کرنا
ذات کے نیرنگ کی تشکیل اور تکمیل
دونوں کے لیے از حد ضروری ہو چکا ہے
دائرہ در دائرہ وسعت پزیر
اس دھند میں
اک زخم کی لو سے منور راستے
میرے بھلا کس کام کے
میں آج بھی تاریکیوں، کوتاہیوں
کی ایک بے حد دل نشیں تاریخ کو
منظوم کرنے میں مگن ہوں
کہیں کوئی۔۔۔!
مجھے معلوم ہے
لیکن۔۔۔!
مرے ہاتھوں کا لکھا کچھ نہیں ہے!

لمحہ موجود کی نظم

کوہ طور کی روشنی
غارِ حرا تک آئی
اور غارِ حرا کی روشنی نے
میرے لہو میں اُجالا کیا
پھر میں اس اُجالے کے کرم سے
سانس لیتے قافلے میں شامل ہوا
اور ایک ایسی بستی میں آ گیا
جہاں لوگ مطلب کی لاٹھی سے
فائدے کی بھیڑیں ہانک رہے ہیں
میں بھیڑ ہوں یا گڈریا کون ہوں ابھی فیصلہ نہیں ہو پایا
اے کوہ طور کی روشنی
اے غارِ حرا کے نور
میری مدد فرما اور مجھے بھیڑ اور گڈریا
بنانے والوں سے بچا
اور مجھے وہی قدیمی بشر بنا دے
جو کوہ طور اور
غارِ حرا کے نور کا طلبگار تھا

اعجاز رضوی

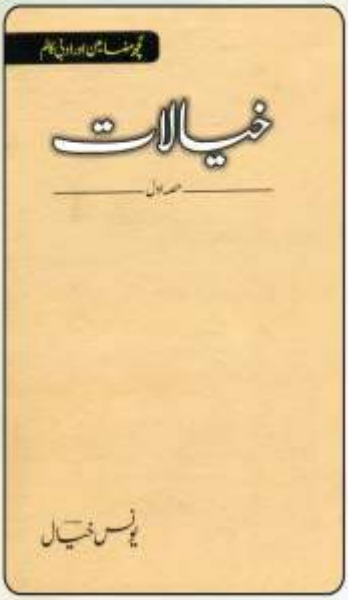
خیالات
یونس خیال

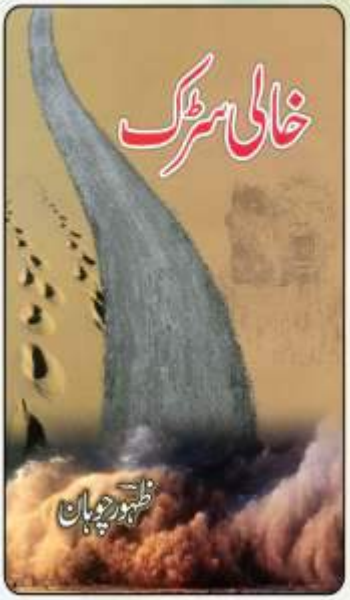
خالی سڑک
ظہور چوہان

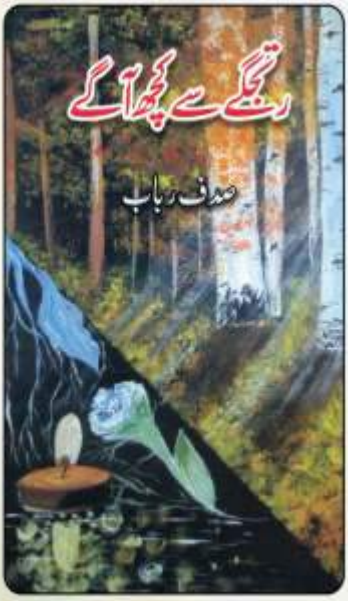
رتجگے سے کچھ آگے
صدف رباب

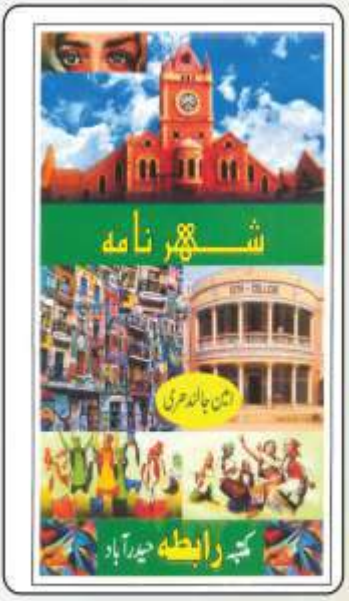
شہر نامہ
امین جالندھری
رابطہ حیدرآباد

ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
دراز پلکوں کے سائے سائے